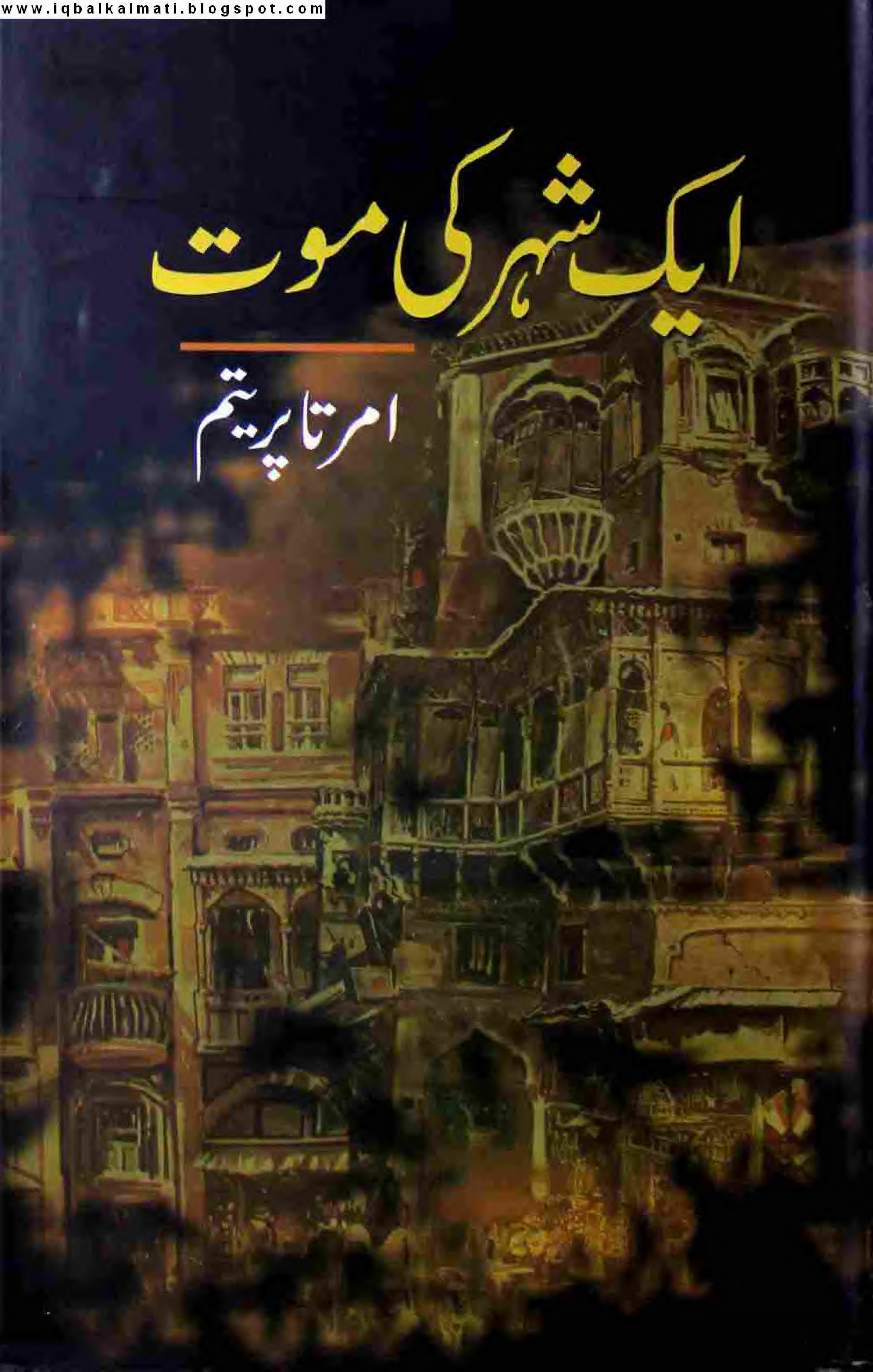
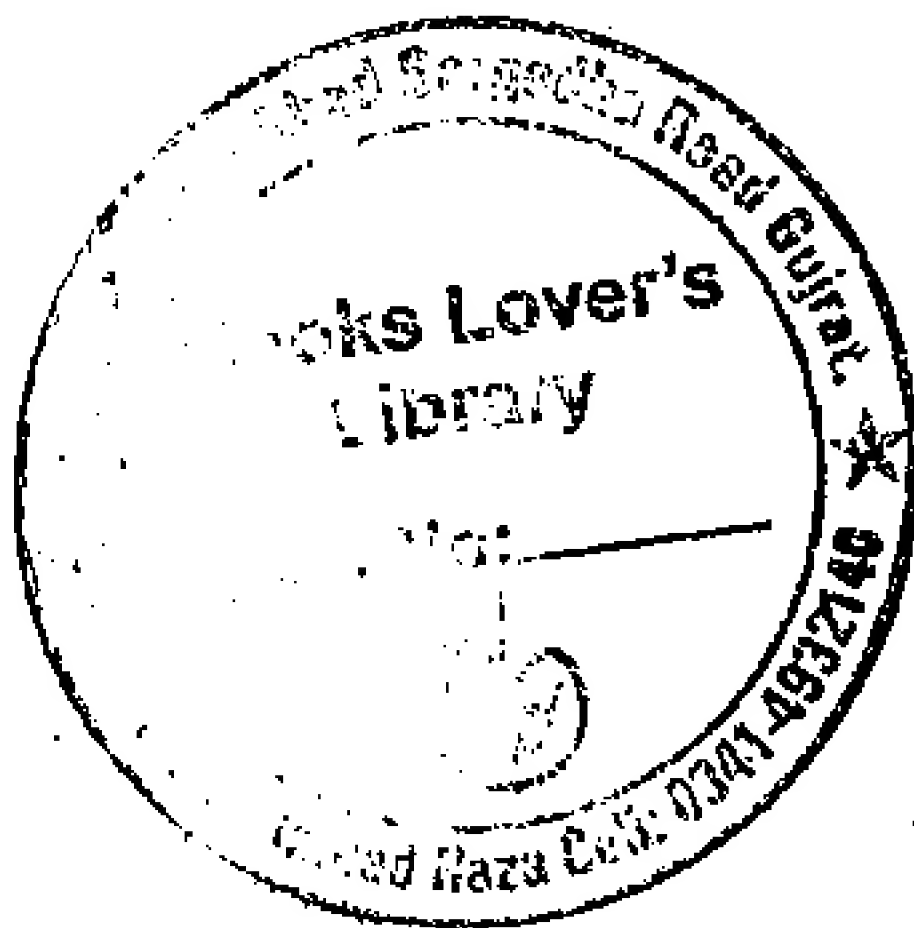


www.iqbalkalmati.blogspot.com
ایک شہر کی موت
امرتا پریتم

ایک شہر کی موت

امرتا پریتم



اُردو ادب

اُردو بازار لاہور

0321-2220225
0300-4252239

تزئین واہتمام/
آصف نواز

ناشر: .... چوہدری عادل شہزاد، علی عمران چوہدری
مطبع: .... کنٹراسٹ پرنٹرز، لاہور
قیمت: .... 110 روپے

ملنے کا پتہ:
چودھری اکیڈمی
الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور
042-7233749

اسٹاکسٹ:

مکتبہ شعر و ادب الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور	علی بُک ھاؤس منیر مارکیٹ اُردو بازار لاہور

اندرونِ صفحات

ایک شہر کی موت

اپنی بات کرنے سے پہلے پامپئی کی بات کروں گی۔

پامپئی نیپلز کے نزدیک اٹلی کا ایک قدیم شہر ہوتا تھا..... اس سے پہلے------ یہ سمندری کنارے کا شہر آٹھویں بی' سی یونان کے سمندری جہازوں کی بندرگاہ ہوتی تھی۔ ۳۱۰ بی' سی میں ایک رومن جہاز یہاں آیا تھا' مگر پامپئی نے اس کو کنارے سے لوٹا دیا تھا۔ لیکن آخر کار شہر فتح کر لیا گیا تھا' اور ۸۰ بی' سی میں یہ رومن کالونی بن گیا تھا۔ پھر اس نے رومن زبان' رومن قانون اور رومن عمارت کاری اپنا لی۔ کاروباری جگہ کے ساتھ یہ آرام گاہ بھی ہوتا تھا۔ اس کی آبادی بیس بائیس ہزار ہوتی تھی۔

فروری ۶۳ء میں یہاں ایک بھیانک زلزلہ آیا۔ بہت کچھ زمین بوس ہو گیا' مگر اس کو دوبارہ بنانا شروع کیا گیا۔

ابھی اس کو دوبارہ بنایا جا رہا تھا کہ ۲۴ اگست ۷۹ء کو یہاں لاوا پھوٹ پڑا' اور سارا شہر آگ کی گرم راکھ کے نیچے دب گیا۔

یہ گرم راکھ بارش کی طرح برسی تھی------ زمین سے چھ انچ اوپر اس کی تہ بچھ گئی تھی' اور یہاں کے لوگ جہاں بیٹھے یا کھڑے تھے' ویسے کے ویسے گرم راکھ میں دب گئے تھے۔

اور یوں سارا شہر اس راکھ کی اور قدرتی گرد کی ۱۲ فٹ اونچی تہہ کے نیچے ڈھک گیا' اور کئی صدیاں ڈھکا رہا۔

سولھویں صدی میں------ ایک نہر نکالتے------ کچھ عمارتوں کے نشان ملے' اور نیپلز کے بادشاہ نے مارچ ۱۷۴۸ء میں باقاعدہ کھدوائی شروع کروائی' اور ۱۷۶۳ء میں سلوں کی لکھائی سے معلوم ہوا کہ وہ پامپئی کے کھنڈرات تھے۔

پہلی بر آمدگی اس کے بت تھے۔ پھر ۱۸۶۰ء میں اس کے اندر مردہ لوگوں کے نشان ملے۔ راکھ میں گڑے جہاں بھی تھے' وہاں پلاسٹر آف پیرس بھر کر بالکل وہی شکل وصورت ڈھونڈھی گئی۔۔۔۔ جیسے لوگ کھڑے' بیٹھے یا دوڑتے ہوئے اس راکھ میں دب گئے تھے۔

اور اس طرح ملا۔۔۔۔ کہ اس شہر کے گھر کس طرح کے ہوتے تھے' پیڑھے' پلنگ اور پنگوڑھے کس طرح کے ہوتے تھے۔ ہاؤس آف سلور ویڈنگ' ہاؤس آف گولڈن کیوپڈ...... اور کہتے ہیں۔۔۔۔ مورت کاری' بت کاری اور عمارت کاری میں یہ ایک بڑا امیر شہر ہوتا تھا......

میں بھی ہوتی تھی۔۔۔۔ پامپئی کی طرح......

پورے پندرہ برس میں اپنی خاموشی میں' اور لندن کی دھندیں لپٹی رہی۔ روزانہ صبح آٹھ کرمس سنگھ کا نام پہلے لیتی تھی' اور ایلنگ کے ایک سکول میں نوکری کے لئے چلی جاتی تھی۔ مگر ان چھٹیوں میں میں روم گئی تھی۔ میں نے روم کے گرجے دیکھے' وہاں کئی عورتیں موم بتیاں جلا رہی تھیں' مگر مجھے کوئی موم بتی جلانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ روم کا وہ چشمہ بھی دیکھا۔۔۔۔ جس میں ایک سکہ ڈال کر لوگ مرادیں مانگتے تھے' مگر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی سکہ نہیں نکالا تھا۔ میں پھر روم سے فلورنس گئی تھی' وہاں پر مائیکل اینجلو کے چوک میں لوگ کبوتروں کو دانہ کھلا رہے تھے' اور ان کو ہتھیلیوں پر بٹھا کر تصویریں اتروا رہے تھے۔۔۔۔ مجھے اپنی تصویر اتروانے کا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن روم سے نیپلز گئی تھی' اور وہاں سے آتے وقت راستے میں پامپئی دیکھا تھا۔ مگر پامپئی کے کھنڈرات میں سے گھوم کر۔۔۔۔ جب لوہے کے بیرونی دروازے کے قریب آئی' تو اس لوہے کے دروازے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس طرح تو کسی مرد نے بھی میرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا' میں کانپ گئی۔

اور لوہے کا دروازہ۔۔۔۔ پچھلی طرف۔۔۔۔ ان کھنڈرات کی طرف چلنے لگا۔۔۔۔ جہاں کئی ستون' اور کئی دیواروں کے ٹکڑے کھڑے ہوئے تھے۔

اور اس کے کہنے پر میں بھی ان کو دیکھنے لگی......

کہیں کوئی بھی پردہ نہیں تھا۔ کبھی ہوتا ہوگا۔۔۔۔ کچھ چاروں طرف سے بند کمرے

ہوتے ہوں گے ــــــ اور پھر ان کے اندر بھی کچھ کوٹھڑیاں۔ مگر اب سب کچھ چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ سارے بھید زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ اور معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کون سا راستہ کہاں سے نکلتا تھا' اور کہاں جاتا تھا۔ راستوں کے گلے لگے ہوئے تھے......

ایک لوہے کے ہاتھ نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا ــــــ میرا ہاتھ سن سا ہونے لگا۔ پہلے میرا داہنا ہاتھ سن ہوا' پھر دایاں بازو' دایاں کندھا۔ پھر بایاں ہاتھ' بایاں بازو' اور بایاں کندھا۔

میں لوہے کے دروازے سے دور ہونے لگی' زور لگایا ــــــ مگر اب میرے پاؤں بھی سن ہونے لگے تھے ــــــ ٹانگیں بھی۔ محسوس ہوا ــــــ میں بھی پامپئی شہر کی بیس ہزار لاشوں کی طرح ایک لاش تھی...... وہاں سے جلدی سے باہر نکلنے کے لئے دایاں پاؤں آگے کیا ہوا' اور بائیں کو آگے کرنے کے لئے اس کی ایڑی ذرا سی اٹھائی ہوئی ــــــ اور پھر وہاں کی وہاں ایک گرم راکھ میں ہمیشہ کے لئے لاش بن کر کھڑی ہوئی......

میں کس دروازے سے نکلی تھی' اور کس راستے پر جانا تھا ــــــ کچھ علم نہیں۔ اب تو سارے گھر گرے ہوئے تھے' اور سارے راستے رو رو کر ایک دوسرے کے گلے کے ساتھ لگے ہوئے تھے......

اور پھر معلوم نہیں' کتنی دیر میری آنکھیں جلتی اور بجھتی رہیں...... اور پھر میری چھاتی میں کچھ ہنسنے لگ پڑا ــــــ کہ اس پامپئی شہر کی طرح میں بھی کبھی ہوتی تھی......

گزشتہ پندرہ برس میں اپنی خاموشی میں اور لندن کی دھند میں ڈھکی رہی۔ معلوم نہیں یہ خاموشی اور یہ دھند کتنے فٹ اونچی تھی ــــــ چھ فٹ ضرور ہوگی ــــــ میرے قد سے دو ہاتھ اونچی ــــــ کہ میں تمام کی تمام اس کے نیچے آگئی تھی......

اور میں نے بھی اس میں کبھی نہیں دیکھا تھا......

اب دیکھ رہی ہوں ــــــ میری چھاتی میں ایک شہر ہوتا تھا' جیسے ہر جوان ہوتی لڑکی کی چھاتی میں ایک شہر ہوتا ہے......

اور میرے شہر میں ایک سب سے بڑے صحن والا ایک گھر ہوتا تھا ــــــ میرے ماں باپ کا گھر ــــــ اور جہاں ایک گھنی چھاؤں والا پیپل ہوتا تھا...... ایک لمبی گلی ہوتی

تھی۔۔۔۔۔ میری ہجولی سہیلیوں کی..... اور گلی کے شروع میں ایک بڑ ہوتا تھا۔۔۔۔ جو تھکے ہوئے مسافروں کو سکھ کی سانس دیا کرتا تھا.....

اور وہاں سے، میری گلی کے موڑ سے، دور ایک اونچی اٹاری نظر آیا کرتی تھی، جہاں رات کو کتنی ہی روشنیاں ستاروں کی طرح جگمگاتی تھیں، اور روزانہ صبح جس کی دیوار میں سے سورج طلوع ہوتا تھا۔ اور میں بھی جیسے ہر جوان لڑکی اپنے شہر کی اونچی اٹاری کو دیکھتی ہے۔۔۔۔ اس اٹاری کو مڑ مڑ کر دیکھا کرتی تھی.....

یہ میرا چھوٹا سا شہر، پھر بڑا ہو گیا تھا۔ میں کالج میں پڑھتی تھی، اور کالج کے ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھی۔ جو ہزاروں نہیں، تو سینکڑوں وہ کردار میرے شہر میں بس گئے تھے، جن کو کہانیوں میں سے نکال کر میں سٹیج پر لائی تھی۔

میرا کتنا بڑا شہر ہوتا تھا، کتنا خوبصورت......پامپئی جیسا.....

یہ بھی سمندر کے کنارے ہوتا تھا۔۔۔ میرا دل سمندر کی طرح بہا کرتا تھا۔ اور جب دوسرے ممالک کی کتابیں پڑھتی تھی، ان کے کردار کشتیوں پر بیٹھ کر میری بندرگاہ پر آجایا کرتے تھے.....

اور پھر ایک دن لاوا پھوٹا تھا، کالا بادل راکھ کی بارش کی طرح برستا رہا تھا، اور سارا شہر اس راکھ کے نیچے دب گیا تھا..... میں۔۔۔ آج سے پندرہ برس پہلے۔۔۔۔ جب اس شہر سے دوڑنے کے لئے دایاں پاؤں آگے رکھا تھا، اور بائیں پاؤں کو آگے کرنے کے لئے اس کی ایڑی تھوڑی سی اٹھائی تھی۔۔۔۔ تو وہاں کی وہاں اس جلتی راکھ میں ہمیشہ کے لئے ایک لاش بن گئی تھی.....

پامپئی شہر کی، اور میرے شہر کی تاریخ ایک جیسی ہے۔ شائد اسی لئے میں پامپئی کے کھنڈرات میں چلتی معلوم نہیں کس وقت اپنے شہر کے کھنڈرات میں پہنچ گئی..... صرف ایک فرق ہے۔۔۔۔ پامپئی کے کسی شخص کو اپنی لاش دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھی، اور میں خود اپنی لاش کو دیکھ رہی ہوں.....

باقی سب کچھ اسی طرح ہے۔ یہ بھی کہ جیسے پامپئی کے کسی آدمی کو کفن نصیب نہیں ہوا تھا، میرے مرے شہر کے بھی کسی آدمی کو کفن نصیب نہیں ہوا۔ سب لاشوں کے چہرے ننگے

ہیں ' پہچان سکتی ہوں.....

اور اس پہچان میں سے سب کے نقش ونگار یاد کر سکتی ہوں۔

یہ میری لاش۔۔۔ چھمک جیسے جسم پر ایک بڑا چمکتا چہرہ ہوتا تھا۔ سیدھی مانگ سے گرتے بال سنوارے ہوتے تھے۔ سفید ریشم کی شلوار اور اکثر سبز رنگ کی قمیض اور سبز رنگ کا دوپٹہ لیتی تھی۔ کانوں میں باریک تار کی بالیاں' منہ معصومانہ بھی ہوتا تھا' لیکن اس پر تانبے جیسی رنگت کی ضد بھی ہوتی تھی' جس سے وہ بڑا نرم کبھی کبھار نظر آتا تھا' کبھی بڑا سخت۔

ہفتہ اور اتوار کو سکول بند ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ دو دن اکیلی کو محال ہو جاتے تھے' اسی لئے چھٹیوں میں روم گئی تھی' ورنہ پورے پندرہ دن گھر کے کمرے میں رہتی' اور چار دیواروں میں پانچویں دیوار بن جاتی۔ مگر روم سے واپس آکر میں جیسے لندن کے اپنے کمرے میں نہیں' کھنڈرات میں چل رہی ہوں۔

آج ہفتہ' کل اتوار' سوچا تھا' دو دن ان کھنڈرات میں رہوں گی' اور ایک لاش کی شناخت کروں گی' مگر رات کو جارج کا فون آگیا۔ اسنے ایک فلم کے دو ٹکٹ خریدے ہوئے تھے' ایک اپنے لئے اور ایک میرے لئے۔ اور مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔

شام کو اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلی گئی۔ ڈی کیمرن۔۔۔ مشہور اطالوی فلم تھی۔ اس میں ایک جوان ہوتی لڑکی کو ایک لڑکا اچھا لگتا ہے' اور وہ لڑکی کو مشورہ دیتا ہے' کہ آج رات وہ اپنے کمرے میں سونے کی بجائے اپنے گھر کی چھت پر سو جائے۔ اور وہ آدھی رات کو گھر کے پچھواڑے کی طرف سے چھت پر آجائے گا۔ لڑکی اپنی ماں کو شام کے وقت کہتی ہے' کہ آج رات کو وہ چھت پر بستر بچھائے گی' اور بلبل کا گیت سنے گی۔ ماں بھی مان جاتی ہے۔ صبح سویرے جب لڑکی کا باپ بیدار ہوتا ہے۔۔۔ سوچتا ہے۔۔۔ چھت پر جا کر لڑکی کو تو دیکھوں' کہیں اس کو سردی لگ گئی ہو۔ اور وہ جب چھت پر جاتا ہے۔۔۔ وہاں اس کی بیٹی کے پاس ایک لڑکا سویا ہوتا ہے۔ دونوں کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں ہوتا۔ وہ گھبرا کر واپس آجاتا ہے' اور اپنی بیوی کو جگاتا ہے۔ کہتا ہے۔۔۔ تمہاری بیٹی آج کوٹھے پر سوئی ہوئی تھی' کہ اس نے بلبل کا گیت سننا ہے' جا کر دیکھو! اس نے بلبل پکڑلی ہے.....

جارج میرے قریب والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا' فلم دیکھتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ اپنی ٹانگوں پر رکھ لیا' اور کہنے لگا۔۔۔۔۔ یہ بلبل تمہاری ہے' لے لو اور فلم کے بعد وہ مجھے میرے گھر چھوڑنے آیا' رات میرے پاس رک گیا۔ اور رات کی فلم کی اس لڑکی کی طرح میں نے بلبل پکڑی تھی.....

اس طرح کی رات میں نے جارج کے ساتھ پہلی دفعہ بسر کی ہے' مگر ویسے پہلی دفعہ نہیں۔ اس طرح کی راتیں کبھی کبھی بسر کر لیتی ہوں۔۔۔۔ کسی کے ساتھ بھی..... پہلی بار۔۔۔۔ بہت گھبرا کر اس طرح کی رات بسر کی تھی۔ ایک دن میرے جسم کا روم روم اس طرح جل اٹھا تھا۔۔۔۔ جیسے میرے جسم کا ایک انگ' میرے انگ انگ میں سما رہا ہو' اور میرے ایک ایک روم کا منہ جیسے رحم کی طرح کھل گیا ہو.....

اس دن ایک عجیب اتفاق ہوا تھا' ورنہ میرے سانس میرے گرد اس طرح کسے ہوئے تھے' کہ میں گرم پانی کی جگہ رات کو ٹھنڈے پانی سے نہا کر بدن کو برف کی ڈلی بنا لیتی' اور لحاف میں گہری نیند سو جاتی۔ مگر اس دن میں۔۔۔۔ اپنی ایک دوست عورت کو ملنے چلی گئی۔ یہ میری انگریز دوست کلیئر عمر رسیدہ عورت ہے۔ اس دن ان نے مجھے ایک چیز دکھائی۔۔۔۔ ایک مردانہ انگ' جو اس ہفتے وہ بازار سے خرید کر لائی تھی۔ اس میں بیٹری کے دو سیل پڑے ہوئے تھے' اور اس نے بتایا کہ وہ بیٹری کی طاقت سے چلتا ہے..... اور اس کے الفاظ اس پر ترس کھا رہے تھے' "کیا کروں' اب اس عمر میں کوئی مرد نزدیک نہیں آتا۔ طلاق لئے سات برس ہو گئے ہیں' پہلے تو کبھی دو چار دنوں کے لئے کوئی مل جاتا تھا' مگر جوں جوں عمر ڈھل رہی ہے....." اور مجھے محسوس ہوا' کہ اگر میں نے اپنی جوانی اپنی سانسوں کو دے دی' تو آئندہ عمر مجھے بھی ایک دن کلیئر کی طرح بازار جانا پڑے گا' اور بیٹری والا یہ ربڑ کا ٹکڑا میری قسمت بن جائے گا.....

اور اس شام میں نے اپنے معمولی سے واقف آدمی کو فون کر کے کھانا کھانے کے لئے بلایا تھا۔ اپنی برسی کے دن کو اپنی سالگرہ بتایا تھا۔ پھر جلدی سے کھانا تیار کیا تھا' اس کے لئے "کیک" خرید کر لائی تھی' کمرے کو تازہ پھولوں سے سجایا تھا۔ اکیلی عورت کے پاس اکیلے مرد نے بمشکل گھنٹہ بھر کتابوں اور فلموں کی باتیں کی تھیں' پھر اس نے بے قراری میں میرا ہاتھ

پکڑ لیا تھا۔ میرا ہاتھ بے بس سا بھی ہو گیا تھا' اور بے صبر بھی۔ اور میرے ہاتھ کی طرح میرا انگ انگ.....

اس دن کی طرح آج بھی پچھتاوا نہیں۔ صرف رات کو۔۔۔ جب جارج میرے ساتھ سویا ہوا تھا۔۔۔ دل میں آیا تھا' کہ آج اس کو اپنے ساتھ اپنے مرے ہوئے شہر میں لے جاؤں۔ جس طرح لوگ پامپئی کے کھنڈرات کو دیکھنے جاتے ہیں' میں جارج کو ساتھ لے جاؤں اور اس کو اپنے شہر کے کھنڈرات دکھاؤں۔

پھر معلوم نہیں کیوں۔۔۔ جارج کو کچھ نہیں بتایا۔ صبح اٹھ کر وہ چائے کا پیالہ پی کر چلا گیا ہے' اور میں اکیلی اپنے شہر کے کھنڈرات میں واپس آگئی ہوں..... یہ میری لاش.....

اور وہ اونچی ہوتی دیواریں اس اٹاری کی ہیں' جس میں وریندر رہا کرتا تھا۔ یہ دیوار کے پاس اس کی لاش ہے' اس کے تمام نقش میری یادداشت میں سے ابھر آئے ہیں۔۔۔ چوڑے کندھوں پر تنا ہوا سر' چہرے کا رنگ گندمی' مگر آنکھیں بہت سیاہ گہری' اور تراشی ہوئیں۔ وہ آنکھوں سے میری جان کو کھینچ لیا کرتا تھا.....

اس کی اس اٹاری میں میں کئی دفعہ رات کو سپنوں میں گئی تھی..... اس کے قول و اقرار سے بھری ہوئی میں' اس کو اس کی گلی کے موڑ پر مل کر جب اپنے باپ کے کھلے صحن والے گھر آیا کرتی تھی۔۔۔ تو گھر کی دیواریں میرے جسم کو نچوڑ لیا کرتی تھیں۔ میرے باپ کے گھورنے سے۔۔۔ پیپل کے پتے جھڑ جاتے تھے' اور میں دھوپ میں جھلس جاتی تھی....

اور ایک دن۔۔۔ میرا کنوارہ جسم چھل گیا۔ گھر آئی کو ماں نے انگاروں جیسی آنکھوں سے دیکھا' اور چولہے سے ایک لکڑی کھینچ کر کہا۔۔۔ "تم کو اس کی اتنی آگ لگی ہوئی ہے' تو یہ چنگاری اپنے اندر ڈال لو....." سپنوں سے اور سہیلیوں سے مردوں کی باتیں سنی ہوئی تھیں' مکھوں جیسی باتیں' مگر ماں کی بات سن کر یوں محسوس ہوا' جیسے جلتی جلتی لکڑی میری ٹانگوں میں گڑ گئی ہو.....

میں کتنے ہی دن بند اپنے کمرے میں روتی رہی..... اور ایک دن ماں کوئی سادھو پکڑ کر لے آئی' اور اس کا دیا ہوا تعویذ گھول کر مجھے زبردستی پلا دیا۔ ساری رات میں چھپ کرتے

کرتی رہی۔ مگر صبح سویرے جب وہ میری منگنی کا چھوہارا مجھے کھلانے لگی۔۔۔۔ معلوم ہوا کسی رنڈوے کے ساتھ میری شادی کرنے لگی تھی۔ وریندر ہمارے مذہب کا نہیں تھا' اور یہ رنڈوا ہمارے مذہب کا تھا۔ میں نے چھوہارے کو منہ میں سے تھوک دیا۔۔۔۔۔ اور ماں کے ہاتھ سے بازو چھڑا کر وریندر کے گھر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی....

اور اچانک زمین سے لاوا نکل پڑا۔۔۔۔ چاروں طرف سیاہ اور جلتی راکھ اڑنے لگی۔۔۔۔ سنا' کہ گزشتہ ہفتے وریندر نے کسی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی..... اور اس جلتے شہر میں سے نکلنے کے لئے میں نے دایاں پاؤں آگے اٹھایا ہوا تھا' اور بایاں پاؤں آگے رکھنے کے لئے ایڑی اٹھائی ہوئی تھی۔۔۔۔ کہ میں ویسے کی ویسے اس گرم راکھ میں ایک لاش بن گئی....

اور یہ میرے شہر کے کھنڈرات میں میری لاش.....

اپنی کہانی

میرا اوپر کا دھڑ ثابت ہے' مگر میری ٹانگیں چوہوں نے کاٹ لی ہیں' اس لئے میں جہاں پڑا ہوا ہوں' وہاں سے ہل نہیں سکتا۔

میری دائیں طرف خربوزوں کے کچھ چھلکے پڑے ہوئے ہیں' بائیں طرف باسی روٹی کا ایک ٹکڑا ہے اور میرے آگے پیچھے کسی نے جھوٹے برتن صاف کر کے راکھ بکھیر دی ہے۔

ابھی ابھی بھوک کی ماری ایک گائے ادھر سے گزری تھی' اس نے اپنی زبان سے مجھے سر سے پاؤں تک چاٹا اور مجھے ایک بیکار چیز سمجھ کر چھوڑ دیا۔ خربوزوں کے چھلکے اسے بڑے کام کے معلوم ہوئے۔ کافی چھلکے اس نے ایک بارگی منہ میں سمیٹ لئے۔

پھر ایک مریل سا کتا آیا اور اپنی دم ہلاتے ہوئے مجھے سر سے پاؤں تک سونگھنے لگا۔ اسے بھی میں بالکل فضول چیز لگا اور وہ میرے پاس پڑے روٹی کے ٹکڑے چبانے لگا۔

پھر منڈیر پر بیٹھا ہوا ایک کوا میری طرف اس طرح آیا کہ گویا کسی حسینہ نے اپنے پیارے کا انتظار کرتے ہوئے اس کے لئے چوری ڈال دی ہو۔ لیکن مجھے چونچ مارتے ہی کوے کا مزہ جاتا رہا اور وہ مجھے چھوڑ کر میرے اردگرد بکھری ہوئی راکھ میں سے چنوں کو ڈھونڈنے لگا اس طرح جہاں پڑا ہوا تھا' وہیں پڑا ہوا ہوں۔

مرتے وقت تو لوگ خیرات کرتے ہیں یا وصیت کرتے ہیں' مگر میں کیا کروں؟ میرے پاس کچھ ہے کہ خیرات کروں' اور پھر میں نے زندگی میں کوئی گناہ بھی نہیں کیا کہ مرتے وقت جلدی سے کوئی ثواب کا کام کر لوں۔۔۔ اور نہ میری کوئی اولاد ہے' جس کے نام پر میں وصیت کروں اور ویسے بھی میں نے زندگی میں لوگوں کی محنت کو چرا کر کوئی خزانہ نہیں بھرا کہ مرتے وقت کسی بھائی بھتیجے کو اس کی حفاظت کے لئے بٹھا جاؤں۔

البتہ کئی لوگ مرنے سے پہلے اپنی سرگذشت لکھتے ہیں وہ میں لکھ سکتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ میں دنیا کا کوئی معزز انسان نہیں ہوں' بلکہ میں ایک معمولی سا نقشہ ہوں ایک چھوٹے سے مکان کا نقشہ! مگر یہ میں آپ کو باور کرا دیتا ہوں کہ میں گاندھی کی طرح آدرش پسند ہوں ٹیگور کی طرح حقیقت پسند اور دستو کی طرح ظاہر پسند' اس لئے میں سوچتا ہوں کہ مجھے مرنے سے پہلے اپنی سرگذشت لکھنی چاہیے۔

ایک دفعہ ایک حسین ترین مرد نے ایک حسین ترین عورت کو دیکھا تھا اور اس کا دل اپنے ہاتھ میں ایک پنسل لے کر کچھ لکیریں کھینچنے لگا تھا۔ بس وہی لکیریں میری لکیریں تھیں۔ ایک چھوٹے سے مکان کے نقشے جیسی لکیریں۔ وہ روز رات کو خوابوں میں ان لکیروں کو سنوارتا رہتا تھا کہ ایک دن اسے وردی پہن کر اس جگہ جانا پڑا' جہاں دن رات بندوقوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

لوگوں کی چیخوں سے میرے کان پھٹتے تھے' پھر بھی میں نے اپنے مالک کے ذہن میں ایک کونہ ڈھونڈ لیا تھا' جہاں میں چپ چاپ پڑا رہتا۔

ایک دن میرے مالک کی خوبصورت چھاتی میں ایک گولی آدھنسی اور وہ تڑپتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا' "تم جلدی سے یہاں سے چلے جاؤ' اس بارود کے دھوئیں میں تمہارا سانس گھٹ جائے گا۔ تم وہاں چلے جاؤ جہاں کوئی کسان ہاتھوں سے بیج بکھیرتا ہے۔ زندگی کے سپنے اگاتا ہے۔ اور جہاں کوئی مزدور سر پر ٹوکری اٹھائے زندگی کے سپنے دیکھتا ہے۔

میں اپنے مالک کی آخری خواہش پوری کرنے کی غرض سے میدان جنگ سے بھاگ آیا اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک کسان کے پاس چلا گیا۔ کسان نے میرے ساتھ ہنس کر دعا سلام بھی نہ کی۔ اپنے پیروں میں ٹوٹی ہوئی جوتی پہنتے ہوئے کہنے لگا" "سر پر قرض چڑھا کر تو میں نے بیج خریدا ہے۔ مجھ سے تو لگان بھی دیتے نہیں بنتا' مجھے تم سے کیا حاصل میری لڑکی کھجور جتنی لمبی ہو گئی ہے۔ اگر میں کسی طرح اسی کا بوجھ اتار سکا' تو میرے لئے بہت بڑی بات ہو گی۔ تم بھائی کسی اور آدمی کے پاس جاؤ۔

تھکا ہارا میں ایک خوبصورت شہر میں چلا گیا۔ میں ایک بڑی سی مل کے مزدور کے پاس پہنچا۔ مزدور نے میرے ساتھ کلام بھی نہ کیا اور اپنے پھٹے ہوئے کرتے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا' "ہماری مل میں چھانٹی ہونے والی ہے اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ میں کل دال چاول کہاں سے

لاؤں گا۔ میں تمہارا کیا کروں گا؟ میرا چھوٹا بچہ کئی دنوں سے بیمار پڑا ہے' اگر میں اس کے لئے کہیں سے دوا بھی لا سکا' تو بڑی بات ہوگی۔ تم بھائی کسی اور آدمی کے پاس جاؤ!"

"کھیتوں میں سے نکالا ہوا اور ملوں سے دھتکارا ہوا میں سانس لینے کے لئے ایک ندی کے کنارے جا بیٹھا۔ اتنی دیر میں میں کیا دیکھتا ہوں کہ ذرا ہٹ کر ایک درخت کے سائے میں ایک بزرگ آدمی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا" "اللہ پاک" "شکر ہے تیرا کہ میرا بیٹا جوان ہو گیا' میرے ہاتھوں کا سہارا بن گیا' اس کی حق کی کمائی کو برکت دینا!"

مجھے محسوس ہوا کہ میں جس آدمی کی تلاش میں تھا' مجھے مل گیا۔ میں جلدی سے اس بزرگ کے پاس چلا گیا۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا" "بس" "بس یہی خواہش ہے کہ ایک کمرے میں میرا بیٹا اور اس کی بیوی بستے ہوں اور میں چھوٹے سے دالان میں بیٹھا پوتے کو کھلاؤں۔" بزرگ نے اپنے دل کا دروازہ کھولا اور میں جلدی سے اندر چلا گیا۔

یہ بزرگ بہت جگتی تھا۔ اس کا بیٹا جب مہینے کے بعد تنخواہ لا کر اس کی ہتھیلی پر رکھتا تو وہ آدھی رقم تھیلی میں ڈال دیتا اور آدھے پیسوں سے گھر کا خرچ چلاتا مجھے بھی امید بندھ گئی کہ تھوڑے سے مہینوں میں یا تھوڑے ہی برسوں میں جون سنور جائے گی۔ وہ بزرگ کہیں سستی سی زمین کا ایک قطعہ بھی ڈھونڈنے لگا اور بیٹے کے لئے کسی اچھی سی لڑکی کا رشتہ بھی پوچھنے لگا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ شہر بھر میں چاقو اور چھریاں چلنے لگیں۔ پولیس کے آدمی جب اس بزرگ کو بچانے آئے تو کہنے لگے" "اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو یہاں سے ایک قافلہ جا رہا ہے' ہم تمہیں اس قافلے میں چھوڑ آتے ہیں۔

وہ بزرگ ابھی حیران ہو کر سپاہیوں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا" "میرا کیا ہوگا؟ آپ شاید جانتے نہیں کہ اس بیچارے بوڑھے نے میرے لئے تھوڑی سی زمین بھی ڈھونڈ رکھی ہے' بس تھوڑے سے مہینوں میں"

پولیس والے ہنسنے لگے اور کہنے لگے "پگلے' اگر تم اپنی بہتری چاہتے ہو تو کسی ہندو کے دماغ میں جا بیٹھو' یہ بوڑھا تو مسلمان ہے۔"

پولیس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی اور میں نے اپنی بات کو مزید واضح طور پر سمجھانے کے لئے کہا" "بڑا ایماندار ہے' اس کا بیٹا بھی خون پسینہ ایک کر کے کماتا ہے۔"

اب پولیس والوں نے میری بات بھی نہ سنی اور اور اس بزرگ اور اس کے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر قافلے میں چھوڑ آئے۔

بزرگ نے مجھے مشورہ دیا۔ "سچ کہتے ہیں یہ پولیس والے۔ جس جگہ میرا باپ پیدا ہوا' جہاں جوان ہوا' جہاں میں پیدا ہوا' پلا اور جوان ہوا' جہاں میرا بیٹا پیدا ہوا اور پل کر جوان ہوا' اگر وہ زمین ہی مجھ سے چھن گئی' تو مجھے تیرا کیا کرنا ہے؟ تو واقعی کسی ہندو کے دماغ میں جا بیٹھ۔"

اس بزرگ کی ڈھلتی عمر میں مجھے اس کے دل سے نکل جانا بہت برا لگا اور میں اس کے دل کے ایک کونے میں بیٹھ کر اس قافلے کے ساتھ چل دیا۔ ابھی کچھ زیادہ فاصلہ طے نہ کیا تھا کہ اس قافلے پر حملہ ہوا اور اس بزرگ کا جوان بیٹا مارا گیا۔ بے حال ہوتے ہوئے وہ مجھ سے کہنے لگا۔" اب میں تیرا کیا کروں گا؟" جو دھرتی میرے بیٹے کے خون کی پیاسی ہو گئی اس دھرتی پر مجھے کوئی گھر نہیں چاہئے۔" اور اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دور پھینک دیا۔

جس طرف یہ قافلہ جا رہا تھا' اس طرف سے ایک قافلہ آ بھی رہا تھا۔ مجھے اداس اور مایوس دیکھ کر اس بزرگ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا" جاؤ میں اللہ کے نام پر تمہیں ان کے حوالے کرتا ہوں' وہ دیکھو' سامنے ہندوؤں کا قافلہ آ رہا ہے' تمہاری طرح ہی اجڑا اور اکھڑا ہوا ہے۔ تم کسی اچھے سے ہندو کے دل میں جا کر بس جاؤ۔ جاؤ میرے عزیز۔"

میں اس بزرگ کی بات نہ ٹال سکا اور اس قافلے کو چھوڑ کر اس قافلے میں چلا گیا۔ ایک مرد اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو دلاسا دے رہا تھا' "ہماری ہمت نہیں جانی چاہئے۔ ہماری جان سلامت' ہمارا جہان سلامت۔ کیا ہوا ہمارے سروں پر چھت نہیں' ہمارے ہاتھوں میں محنت بستی ہے۔" میں جھٹ اس مرد کے پاس گیا اور میں نے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا' جن ہاتھوں سے محنت کی خوشبو آ رہی تھی۔

سورج غروب ہی ہوا تھا کہ سارے قافلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ حملہ آور آئے اور اس قافلے کی کئی عورتیں اٹھا کر لے گئے۔ لوگوں کو تسلی دینے والا' میرا مالک اپنا سر پکڑ کر مجھ سے کہنے لگا' "دوست تم جاؤ' جو بھی راستہ تمہیں نظر آئے۔ تم میرے بھاگ میں نہیں ہو۔ جس دھرتی پر میری بیوی چھن گئی' اس دھرتی پر میرا گھر نہیں بن سکتا۔" اور اس نے مجھے ایک مرے ہوئے بچے کی طرح اپنے ہاتھوں سے ایک طرف پھینک دیا۔

میں گھومتا رہا' بھٹکتا رہا۔ میں اس کوٹھری کے مکین کے پاس بھی گیا جس سے اس کا مالک مکان اس لئے گالی گلوچ کرتا رہتا تھا کہ وہ کوٹھری کا کرایہ نہیں بڑھا سکتا تھا۔ میں اس شخص کے کمرے میں بھی گیا' جو صبح کے وقت ایک گیت لکھنے لگتا تھا' تو اوپر کی منزل پر رہنے والی ایک عورت مصالحہ پیسنے لگ جاتی تھی۔ میں اس آدمی کے پاس بھی گیا' جس کا پڑوسی روز رات کو شراب پی کر آتا تھا اور اس کی جوان بیٹی کو بڑی بے حیائی سے گھورتا تھا اور وہ آدمی اس کوٹھری کو نہ بدل سکنے پر مجبور تھا' کیونکہ اتنے کرائے پر اور کہیں کوٹھری نہ مل سکتی تھی اور میں اس آدمی کے کمرے میں بھی گیا جس کی بیوی نچلی چھت سے پانی کی بالٹیاں بھر کر اوپر لاتی تھی اور اور جس کا تین مہینے کا حمل گر گیا تھا..... مگر ان سب لوگوں میں سے کسی نے بھی میرے ساتھ آنکھ نہ ملائی۔

ان کوٹھریوں اور کمروں کے جھرمٹ میں ہی ایک اور کوٹھری بھی تھی' جہاں دن رات کتابیں پڑھنے رہنے والا ایک بانکا نوجوان رہتا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس کی ماں نے اپنے زیورات بیچ بیچ کر اسے پڑھایا ہے اور اب اسے کوئی نہ کوئی روزگار ملنے ہی والا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس نوجوان کو اپنے کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی سے محبت ہے۔ جس طرح میں نے کئی ایک کوٹھریوں کا حال دیکھا تھا' ویسے ہی اس نوجوان نے بھی دیکھا اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ کسی ایسی کوٹھری میں نہیں رہے گا' جس کا مالک روز گالی گلوچ کرتا ہو اور وہ اس کی کوٹھری کی چھت کے نیچے بھی نہیں رہے گا جہاں وہ بیوی کو بازوؤں میں جکڑ کر کوئی گیت گنگنانے لگے' تو اوپر کی چھت سے کوئی زور زور سے مصالحہ پیسنے لگے اور وہ اپنی بیوی کو کسی ایسی کوٹھری میں نہیں رکھے گا' جس کا پڑوسی شراب پی کر آئے اور اسے بے شرم آنکھوں سے گھورتا رہے اور وہ تیسری منزل پر بھی نہیں رہے گا' جہاں پانی کی بالٹیاں چڑھاتے ہوئے اس کی بیوی کا حمل ساقط ہو جائے۔

اس لئے جب میں اس نوجوان کے سامنے پہنچا' تو اس نے مجھے پلکوں پر اٹھا لیا اور اپنی ماں سے کہنے لگا بس! "اماں' اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔ پتا جی نے ہمارے لئے جو زمین کا ٹکڑا خریدا تھا' اب میں وہاں ایک چھوٹا سا گھر بناؤں گا۔ میرا روزگار تو لگ ہی جائے گا اور آٹھ ہزار' ہم سرکار سے قرضہ لے لیں گے۔ اب تو ہمارا اپنا راج ہے۔" میں نے یہ باتیں سنیں اور ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح اس نوجوان کے دل کی ٹھنڈی چھایا میں بیٹھ گیا۔

ایک دن اس نوجوان نے ایک نقشہ نویس کو بلایا اور اپنے دل میں کھینچی ہوئی میری ساری

لکیروں کو اسے سمجھا دیا اور اس سے کہا وہ جلدی سے ایک چھوٹے سے گھر کا نقشہ بنا لائے۔

ایک عرضی اس نے سرکار کو دے دی کہ اس کو مکان بنانے کے لئے قرضہ چاہئے اور درجنوں عرضیاں اس نے کئی سرکاری دفتروں میں بھیجیں کہ جلدی سے روزگار دیا جائے۔

میں نے پہلی بار کسی پنسل کا منہ چوما اور پہلی بار کسی کاغذ سے بغل گیر ہوا۔ نقشہ نویس نے مجھے نہایت خوبصورت نیلے کاغذ میں لپیٹ لیا اور میرے مالک سے کہنے لگا" تیس روپیہ نقشہ بنوائی، تیس روپے کمیٹی والوں کے اور تیس روپے نقشہ پاس کرانے کے۔"

میرے مالک نے نقشے والے کو پیسے دے دیئے۔ کمیٹی والوں کی فیس ادا کر دی مگر اس نے نقشہ پاس کرانے کا کچھ نہ دیا اور کہا" میں آزاد ملک کا ایک شریف شہری ہوں، اپنے وطن میں گھر بنانا میرا حق ہے اور اگر میرے گھر کا نقشہ کمیٹی کے اصولوں کے مطابق ٹھیک ہے؟ تو یہ ضرور ہی پاس ہونا چاہئے۔" نقشہ نویسوں نے بہت سمجھایا مگر میرے مالک کو اپنے اصولوں پر ناز تھا۔ خیر میں ایک فائل میں لگ کر کمیٹی میں داخل ہو گیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ کمیٹی کے دفتر میں کھڑے کھڑے میری ٹانگیں اکڑ گئیں۔ ایک دن ایک افسر نے دوسرے کے کان میں کہا" اس فائل کو دبا رکھو، جسے نقشہ پاس کرانا ہو گا، اپنی مٹھی ڈھیلی کرے گا۔" اور مجھے جیتے جی ہی ایک ٹوٹی ہوئی میز کی قبر میں دبا دیا گیا۔

جوں جوں میری سانس گھٹنے لگا، میں سوچنے لگا کہ مجھے تو پہاڑوں اور بیلچوں سے کھیلنا تھا۔ سرخ اینٹیں، سلیٹی سیمنٹ، اور پھر میرا قد اور بہت بڑھتا جاتا، میری لکیریں ابھرتی جاتیں۔ مزدور عورتوں کے لال پیلے دوپٹے ہوا میں اڑتے، چاندی کی چوڑیاں میرے کانوں میں کھنکتیں، کانچ کی چوڑیاں میرے ارد گرد چھن چھن کرتیں اور مزدوروں کے جسموں میں سے محنت کے پسینے کی مہک آتی۔۔۔ اور پھر۔۔۔ پھر میرا مالک اپنی محبوبہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر میری طرف اشارہ کرتا، "ہمارا گھر، میری جان، ہمارا اپنا گھر۔" اور پھر میرا مالک اپنی بوڑھی ماں کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر میری طرف لاتا" اماں، تم نے مجھے مصیبتیں جھیل کر پالا تھا، دیکھو میں نے تمہارے لئے گھر بنا لیا ہے۔" اور پھر میرے مالک کے تصور میں ایک ننھا سا بچہ کھیلنے لگتا۔

مگر میں تو جیتے جاگتے ہی ایک ٹوٹی ہوئی میز کی قبر میں پڑا ہوا تھا۔ اور پھر ایک دن مجھے محسوس ہوا گویا کوئی آہستہ آہستہ میری قبر کھود رہا ہو۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ میں نے اپنی ساری توجہ مرکوز

کی۔ دل میں امیدیں بندھنے لگیں۔ مگر افسوس! یہ تو چوہے تھے جو میرے پیروں کو کتر رہے تھے' میری ایڑیوں کو کتر رہے تھے' میرے گھٹنوں کو کتر رہے تھے' میری امیدوں کو کتر رہے تھے۔

اور پھر قیامت کا دن آ گیا۔ میں اور میرے جیسے اور کتنے ہی لوگ قبروں سے نکالے گئے۔ کمیٹی کا ایک افسر عزرائیل فرشتے کی طرح ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے منشی کو حکم دیا کہ یہ سب نقشے ان کے مالکوں کو واپس کر دو' یہ نقشے پاس نہیں ہو سکتے' کیونکہ انہیں چوہے کتر گئے ہیں۔

میں رینگتے رینگتے اپنے مالک کے پاس پہنچا۔ نقشہ نویس نے میرے مالک سے بڑے تجربہ کار جیسی سنجیدہ آواز میں کہا ''میں نے کہا تھا نا کہ چاندی کے پہیوں کے بغیر یہ گاڑیاں نہیں چل سکتیں! آپ خواہ اصولوں کے کتنے ہی انجن ان کے آگے جوڑ دیجئے۔''

میرے مالک کی آنکھیں بھر آئیں اور میں نے منت سے کہا۔ چلو' اگر میرے نصیب میں اس زمین پر پاؤں رکھنا نہیں لکھا ہے' تو مجھے پہلے ہی کی طرح اپنے دل میں بٹھا لو' اپنے دماغ میں ہی رکھ لو۔''

''اب تو تم وہاں بھی نہیں رہ سکتے۔'' میرے مالک نے ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگا، ''کیونکہ وہاں بھی بہت سے چوہے پیدا ہو چکے ہیں۔ تمہارا نچلا دھڑ تو پہلے ہی کترا جا چکا ہے' وہاں اوپر کا دھڑ بھی کترا جائے گا۔''

''تمہارے دل اور دماغ میں چوہے؟''

''ہاں میرے دوست' جس طرح یہ کمیٹی والے ایسے چوہے پالتے ہیں' جو مکانوں کے نقشے کتر جاتے ہیں' اسی طرح سماج والے بھی ایسے چوہے پالتے ہیں' جو خوابوں کے نقشے کتر ڈالتے ہیں۔''

''تمہارے قرضے کی عرضی کا کیا ہوا؟''

''سرکار نے جانچ پڑتال کی تھی کہ میرے پاس پہلے سے کوئی میرا اپنا گھر تو نہیں؟ میری ماں کے پاس کوئی اپنا گھر تو نہیں؟ میرے باپ کے پاس کوئی اپنا گھر تو نہیں؟ ہندو خاندان کو چونکہ مشترکہ خاندان سمجھا جاتا ہے' اس لئے میرے کسی بھائی بند کے پاس کوئی اپنا گھر تو نہیں؟ اور پھر میرے دادا پڑدادا کا وراثت میں چھوڑا ہوا کوئی گھر تو نہیں؟ اور اگرچہ میں نے سرکار کو یقین دلایا تھا کہ جب سے ہندو کی نسل سے انسان پیدا ہوا ہے' میرے خاندان میں کبھی کسی کے پاس اپنا گھر نہیں

تھا‘ مگر اس کے باوجود انہوں نے نہ جانے میری عرضی کو کسی طرح کی افیون کھلادی ہے کہ وہ کسی میز کی دراز میں جا سوئی۔“

”اور تمہارے روزگار کی عرضی؟“

وہ اس طرح کی بن گئی ہے‘ جیسے کوئی کنواری لڑکی بر ڈھونڈتے ڈھونڈتے بوڑھی ہو جائے۔“

”اور تمہاری محبت کی عرضی؟“

”اس لڑکی کا باپ کہتا ہے کہ جس کے پاس گھر نہیں‘ روزگار نہیں‘ اسے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔“

اور میرے مالک نے مجھے بڑی عزت سے ایک گھوڑے پر رکھ دیا اور خود اپنی زمین کا سودا کرنے کے لئے چل پڑا۔ جسے بیچ کر اسے چولہے میں آگ جلتی کچھ لکڑیاں خریدنی تھیں۔

”میں؟“ میں نے گھبرا کر اپنے جاتے ہوئے مالک کو آواز دی۔

میرے مالک نے ایک منٹ ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا‘ اور پھر بڑے اطمینان سے جواب دیا‘ ”اگر تمہیں اپنی اتنی ہی فکر تھی‘ تو تمہیں کسی سیٹھ بیوپاری کے دل میں جا بیٹھنا تھا‘ پھر تمہارا ایک چھوٹا سا گھر تو کیا محل تک بھی بن جاتا۔“

”تم مجھے غلط سمجھے ہو‘ میرے مالک! میں تو صرف اس آدمی کے چھوٹے سے گھر کا نقشہ ہوں‘ جس کے دسوں ناخنوں میں‘ کہتے ہیں‘ برکت ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

اور میرا مالک اپنے دسوں ناخنوں کو بار بار دیکھتا ہوا گلی میں سے باہر چلا گیا۔

بو

گھوڑی ہنہنائی، کلیری دوڑ کر اندر سے باہر آئی، اس نے گھوڑی کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ گھوڑی اس کے میکے کی تھی۔ اس نے گھوڑی کی گردن کے ساتھ اپنا سر لگا لیا، جیسے وہ گھوڑی کی گردن نہیں، اس کے مائکہ کی چوکھٹ ہے۔

کلیری کا مائکہ چمپا شہر تھا۔ سسرال کا گاؤں لکڑ منڈی اور کھجیار کے راستے میں ایک اونچی سطح پر تھا۔ کھجیار سے تقریباً ایک میل آگے چل کر پہاڑی کا ایک ایسا موڑ آتا تھا، جہاں کھڑے ہونے پر چمپا بہت دور اور بہت نیچا دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی کلیری جب اداس ہو جاتی تو مانک کو ساتھ لے کر اس موڑ پر آ کر کھڑی ہو جاتی، جہاں سے چمپا شہر کے مکان جگمگاتے نقطوں کی طرح دکھائی دیتے۔ پھر وہ نقطے اس کے دل میں ایک چمک پیدا کر دیتے۔

مائکہ وہ سال میں ایک بار آشیوں کے مہینے میں جاتی تھی۔ ہر سال ان دنوں اس کے مائکہ میں چوگان کا میلہ لگتا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کو لینے کے لئے کسی نہ کسی کو بھیج دیتے تھے۔ صرف کلیری کے ہی نہیں، کلیری کی سبھی سہیلیوں کے مائکہ سے انکے بلاوے آتے تھے۔ سبھی سہیلیاں جب ایک دوسرے سے گلے ملتیں تو سال بھر کی خوشی و غم کی سبھی باتیں ایک دوسرے سے کہہ سن لیتیں اور اپنے مائکہ کی گلیوں میں ہرنیوں کی طرح چوکڑی بھرتی مست گھومتی پھرتی تھیں۔

دو دو! تین تین، بچوں کی مائیں بڑے بچوں کو دادا، دادی کے پاس چھوڑ آتیں اور گود والوں کو مائکہ پہنچتے ہی ننہیال والوں کے حوالے کر دیتیں۔ میلے کے لئے نئے کپڑے سلواتیں، چزیاں رنگواتیں اور ان میں ابرق ڈلواتیں۔ میلہ میں کانچ کی چوڑیاں اور چاندی کی بالیاں خریدتیں۔ میلہ میں خریدے ہوئے خوشبودار صابن کی بٹیوں کو اپنے بدن پر ایسے ملتیں، جیسے وہ اپنے کنوارے پن کی خوشبو سونگھنا چاہتی ہوں۔

گلیری بہت دنوں سے آج کے دن کا انتظار کر رہی تھی۔ آشیوں کا آسمان جب ساون بھادوں کی برساتوں کے ساتھ ساتھ پاؤں دھو کر نکھر آتا تھا' گلیری اور گلیری کی ایسی سسرال میں بیٹھی لڑکیاں مویشیوں کو دانا پانی ڈالتیں۔ ساس سسر کے لئے دال چاول پکاتیں اور ہر روز ہاتھ منہ دھو کر بن سنور کر بیٹھتیں' تو دل ہی دل میں سوچتیں' آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں' کوئی نہ کوئی انکے میکے سے ان کو لینے کے لئے آتا ہو گا۔

آج گلیری کے گھر کے دروازے کے سامنے اس کے مائکہ کی گھوڑی ہنہنائی تو گلیری بے تاب ہو گئی۔ گھوڑی کو لے کر نھتو کا ماما آیا تھا۔ اس کو اس نے بیٹھنے کی چوکی دی۔

گلیری کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت خود ہی دل کی بات بتا رہی تھی۔ مانک نے تمباکو کا ایک لمبا کش لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے وہ تمباکو کی کیفیت نہ کر پایا' یا گلیری کے چہرے کی رنگت۔

"اس بار تو میلہ دیکھنے آئے گا نا' چاہے صبح آئے اور شام کو لوٹ جائے!" گلیری نے مانک کے پاس بیٹھ کر محبت آمیز لہجے میں کہا۔

مانک کے ہاتھ کانپے اس نے چلم کو ایک طرف رکھ دیا۔

"بولتا کیوں نہیں؟" گلیری نے غصہ میں کہا۔

"گلیری ایک بات کہوں؟"

"میں جانتی ہوں' تجھے کیا کہنا ہے۔ کیا یہ بات تجھے کہنا چاہیے؟ سال میں ایک بار تو میں مائکہ جاتی ہوں' پھر تو مجھے ایسے کیوں روکتا ہے؟"

"پھر اس سے پہلے تو میں نے تجھ سے کبھی بھی کچھ نہیں کہا۔"

"پھر اس بار کیوں کہتا ہے؟"

"اس بار...... بس اس بار....." مانک کے منہ سے ایک لمبی آہ نکل آئی۔

"تیری ماں تو مجھے کچھ کہتی نہیں' پھر تو کیوں روکتا ہے؟" گلیری کی آواز میں بچوں جیسی ضد تھی۔

"میری ماں....." مانک نے اپنا منہ بند کر لیا۔ جیسے گفتگو کو طول دینے سے بچانے کے لئے الفاظ کو دانتوں کے نیچے دبا لیا ہو۔

دوسرے دن کلیری منہ اندھیرے بن سنور کر تیار ہو گئی۔ کلیری کا نہ تو کوئی بڑا بچہ تھا اور نہ کوئی گود میں۔ نہ کسی کو سسرال میں چھوڑنا تھا' نہ کسی کو مائکہ لے جانا تھا۔ نھتو نے گھوڑے پر زین کسی' اور کلیری کی ساس سسر نے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"چل' دو کوس میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔" مانک نے کہا۔ کلیری نے خوش ہو کر مانک سے بانسری لے لی اور اپنے آنچل میں رکھ لی۔

وہ کھجیار پار کر گئے۔ ایک کوس اور آگے بڑھ گئے۔ چمپا کی ڈھال شروع ہو گئی۔ کلیری نے آنچل سے بانسری نکالی اور مانک کے ہاتھوں میں دے دی۔

سامنے مشکل ڈھال تھی' پاؤں جیسے پھسل رہے تھے۔ کلیری نے مانک کا ہاتھ پکڑا اور رک کر کہنے لگا' "بجاتا کیوں نہیں بانسری؟"

خیالات بھی جیسے کوئی مشکل ڈھال اتر رہے تھے' مانک کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ کلیری نے جب مانک کا ہاتھ پکڑا تو مانک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بجاتا کیوں نہیں بانسری؟" کلیری نے پھر کہا۔

مانک نے بانسری ہونٹوں سے لگا لی' اس کو پھونکا' لیکن بانسری سے ایسا سر نکلا' جیسے بانسری کی زبان پر چھالے پڑ گئے ہوں۔

"کلیری' تو نہ جا' میں تجھ سے پھر کہتا ہوں' نہ جا' اس بار نہ جا۔"

مانک نے بانسری کلیری کو واپس کر دی۔

"کوئی بات تو ہو! اچھا' تو میلہ کے دن چلے آنا' میں تیرے ساتھ لوٹ آؤں گی' اس سے زیادہ نہ رہوں گی' سچ کہتی ہوں' پکی بات۔"

مانک نے کچھ نہ کہا' لیکن اس نے کلیری کے چہرے کی طرف ایسے دیکھا' جیسے وہ کہنا چاہتا ہو' "کلیری یہ بات پکی نہیں' یہ بہت کچی ہے۔" لیکن مانک کے تصورات میں کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا۔

مانک تصورات کی دنیا میں گذشتہ سات برسوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہی دن تھے' جب مانک اپنے دوستوں کے ساتھ اس سڑک کو پار کرتا ہوا چوگان کا میلہ دیکھنے چمپا گیا تھا۔ سب میلہ میں کانچ کی چوڑیوں سے لے کر گائیں' بکریاں تک کچھ نہ کچھ خرید اور بیچ رہے

تھے۔ اسی میلہ میں مانک نے کلیری کو دیکھا اور مانک کو کلیری نے۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کا دل خرید لیا تھا۔

وہ دونوں وقت دیکھ کر ایک دوسرے سے ملے تھے ''تو دودھیا بھٹے جیسی ہے'' مانک نے کہا تھا اور کلیری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''لیکن کچے بھٹے پر تو جانور منہ مارتے ہیں۔'' یہ کہہ کر کلیری نے ہاتھ چھڑا لیا اور مسکراتے ہوئے کہا تھا' ''انسان تو بھٹے کو بھون کر کھاتے ہیں۔ اگر' ہمت ہے تو میرے باپ سے رشتہ کی بات کر لے۔''

مانک کے یہاں جب بھی کسی کی شادی ہوتی ہے' تو لڑکے والے سودا کرتے ہیں۔

مانک ڈر رہا تھا کہ نہ جانے کلیری کا باپ کتنا روپیہ مانگ لے۔ لیکن کلیری کا باپ کھاتا پیتا آدمی تھا اور پھر وہ دور شہر میں بھی رہ آیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ پر فیصلہ کر لیا تھا کہ لڑکے والوں سے بیٹی کے پیسے نہیں لوں گا۔ جہاں پر اچھا گھر اور رشتہ ملے گا' وہیں اپنی لڑکی کی شادی کر دوں گا۔ مانک کو اس میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ دونوں کے دل ملے ہوئے تھے' دونوں نے شادی کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

''آج تو کیا سوچ رہا ہے؟ تو مجھے اپنے دل کی بات کیوں نہیں بتاتا؟'' کلیری نے مانک کے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

مانک نے کلیری کی طرف ایسے دیکھا' جیسے اس کی زبان پر چھالے پڑ گئے ہوں۔

گھوڑی ہنہنائی۔ کلیری کو آگے کے راستہ کا خیال آ گیا۔ وہ چلنے کے لئے تیار ہوئی اور مانک سے کہنے لگی' ''آگے چل کر نیلے پھولوں کا جنگل آتا ہے' کوئی دو میل ہو گا۔ تو جانتا ہے نا' اس جنگل کو پار کرنے والوں کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔''

''ہاں!'' مانک نے دھیرے سے کہا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے' جیسے ہم اس جنگل سے گزر رہے ہیں۔ تجھے میری کوئی بات سنائی ہی نہیں دیتی ہے۔'' مانک نے ایک لمبی سانس لی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا' لیکن دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں سکے۔

''مانک اب تو واپس چلا جا' تو بڑی دور آ گیا ہے۔'' کلیری نے دھیرے سے کہا۔

"تو اتنا راستہ پیدل چلتی آئی ہے گھوڑے پر نہیں بیٹھی' اب گھوڑے پر بیٹھ جانا۔"
مانک نے اسی طرح دھیرے سے کہا۔

"یہ لے پکڑ اپنی بانسری۔"

"تو اپنے ساتھ ہی لے جا۔"

"میلے کے دن آکر بجاؤں گا؟" کلیری ہنس دی۔ اس کی آنکھوں میں دھوپ چمک رہی تھی۔

مانک نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا' شاید اس کی آنکھوں میں بادل امنڈ آئے تھے۔

"ماں...." گھر پہنچ کر مانک اس طرح پلنگ پر گر پڑا جیسے وہ بڑی مشکل سے پلنگ تک پہنچ پایا ہو۔

"بڑی دیر لگا دی۔ میں تو سوچتی تھی' شاید تو اس کو گھر تک چھوڑنے چلا گیا ہے۔" ماں نے کہا۔

"نہیں ماں گھر تک نہیں گیا' بیچ راستے ہی میں---- چھوڑ آیا ہوں۔" مانک کا گلا رندھ گیا۔

"عورتوں کی طرح روتا کیوں ہے؟ مرد بن۔" ماں نے غصے سے کہا۔

مانک کے دل میں آیا کہ وہ کہہ دے' "لیکن تو' تو عورت ہے ایک مرتبہ عورتوں کی طرح روتی کیوں نہیں۔"

مانک کو کلیری کی ایک بات یاد رہ گئی۔ ہم نیلے پھولوں والے جنگل سے گزر رہے ہیں' جہاں ہر ایک کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ مانک کو ایسا محسوس ہوا کہ آج کسی کو بھی اس کی بات سنائی نہیں دیتی۔ ساری دنیا جیسے نیلے پھولوں کا جنگل ہے اور سب کے کان بہرے ہو گئے ہیں۔

سات سال ہو گئے تھے' کلیری کی ابھی تک گود نہیں بھری تھی۔ ماں کہتی تھی' اب میں آٹھواں سال نہ لگنے دوں گی۔ ماں نے پانچ سو روپیہ دے کر اندر ہی اندر مانک کی دوسری شادی کی بات پکی کرلی تھی۔ وہ اس وقت کے انتظار میں تھی' جب کلیری ماٹکہ جائے گی اور وہ نئی بہو کا ڈولا لے کر گھر آئے گی۔

اس کے بعد مانک کو ایسا محسوس ہوا' جیسے وہ بے حس ہو گیا ہے۔ گلیری کا پیار اس کے دل میں چٹکی لے رہا تھا۔ نئی بہو کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے کی ہنسی اس کے دل کو گدگدا رہی تھی۔ لیکن اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا' جیسے اس کا دل سو گیا تھا۔

ساتویں دن مانک کے گھر اس کی نئی بہو بیٹھی ہوئی تھی۔ مانک کے سبھی اعضاء جاگ رہے تھے' ایک اس کا دل سویا ہوا تھا۔ دل کے سوئے ہوئے گوشت کو اس کے بیدار اعضاء سبھی جگہوں پر لے گئے تھے' نئی سسرال میں بھی اور نئی بہو کے بچھونے پر بھی۔

مانک منہ اندھیرے اپنے کھیت میں بیٹھا ہوا تمباکو پی رہا تھا' اسی وقت اس کا ایک پرانا دوست وہاں سے گزرا۔

"اتنے سویرے سویرے کہاں چلا ہے بھوانی؟"

بھوانی ایک منٹ چونک کر ٹھہر گیا۔ اس کے کندھے پر ایک چھوٹی سی گٹھری رکھی ہوئی تھی۔ پھر بھی دھیرے سے کہنے لگا۔

"کہیں نہیں۔"

"کہیں تو چلا ہے۔ آ بیٹھ' تمباکو پی لے۔" مانک نے آواز دی۔

بھوانی بیٹھ گیا اور مانک کے ہاتھ سے چلم لے کر کش لیتے ہوئے کہا:

"چھپا جا رہا ہوں' آج وہاں میلہ ہے۔"

میلہ کے لفظ نے اس کے دل میں جانے کون سی سوئی چبھو دی۔ مانک کو محسوس ہوا' جیسے اس کے جسم میں اندر کہیں درد ہو رہا ہے۔

"آج میلہ ہے؟" مانک نے کہا۔

"ہر سال آج کے دن ہی ہوتا ہے۔" بھوانی نے کہا' پھر مانک کی طرف ایسے دیکھا' جیسے وہ یہ بھی کہہ رہا ہو' "تو بھول گیا ہے' اس میلہ کو؟ سات برس ہوئے' جب تو میلہ میں گیا تھا۔ میں بھی تو تیرے ساتھ تھا۔ تو نے اسی میلے میں محبت کی تھی۔"

بھوانی نے کچھ بھی نہیں کہا' لیکن مانک کو ایسا محسوس ہوا' جیسے اس نے سب کچھ سن لیا ہو۔ اس کو بھوانی پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ سن رہا ہے۔

بھوانی مانک کی چلم چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیٹھ پر لٹکی ہوئی گٹھری سے بانسری کا

ایک سرا جھانک رہا تھا۔ بھوانی جا رہا تھا' مانک اس کی پیٹھ کو دیکھتا رہا۔ پیٹھ پر رکھی ہوئی چھوٹی سے گٹھری کو دیکھتا رہا۔ گٹھری سے نکلے ہوئے بانسری کے سرے کو دیکھتا رہا۔

بھوانی اور بھوانی کی بانسری میلہ جا رہی تھی۔ مانک کو اپنی بانسری یاد آ گئی' جب میکہ جاتے وقت اس نے کلیری کو اپنی بانسری دیتے ہوئے کہا تھا' اسے تو ساتھ ہی لے جا' پھر مانک کو خیال آیا اور میں؟

مانک کا دل چاہا کہ وہ بھوانی کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ اپنی اس بانسری کے پیچھے دوڑ پڑے' جو اس سے پہلے ہی میلہ چلی گئی تھی۔

مانک نے ہاتھ سے چلم پھینک دی اور بھوانی کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑا۔ پھر مانک کی ٹانگیں کانپنے لگیں' وہیں کا وہیں بیٹھ گیا۔

مانک کو سارا دن اور ساری رات میلہ جاتے ہوئے بھوانی کی پیٹھ دکھائی دیتی رہی۔

دوسرے دن تیسرے پہر کا وقت تھا' جب مانک اپنے کھت میں بیٹھا ہوا تھا' اس کو میلے سے آتے ہوئے بھوانی کا چہرہ دکھائی دیا۔

مانک نے منہ ایک طرف پھیر لیا۔ اس نے چاہا کہ اسے نہ تو بھوانی کا چہرہ دکھائی دے اور نہ بھوانی کی پیٹھ۔ اس بھوانی کو دیکھ کر اس کو میلہ کی یاد آ جاتی تھی اور وہ میلہ اس کے دل کو جگا دیتا تھا۔

مانک نے منہ پھیر لیا۔ بھوانی چکر کاٹ کر بھی مانک کے سامنے آ بیٹھا۔ بھوانی کا منہ ایسا تھا' جیسے کسی نے سرخ انگارے پر ابھی ابھی پانی ڈالا ہو اور مانک نے ڈرتے ہوئے بھوانی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کلیری مر گئی۔" بھوانی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کلیری مر گئی؟"

"اس نے تمہاری شادی کی بات سنی اور مٹی کا تیل اپنے اوپر چھڑک لیا!"

"مٹی کا تیل۔"

اس کے بعد مانک بولا نہیں۔ پہلے بھوانی ڈرا' پھر مانک کے ماں باپ ڈر گئے اور مانک کی نئی نویلی دلہن ڈر گئی کہ مانک کو پتہ نہیں کیا ہو گیا' وہ نہ کسی سے بولتا تھا اور نہ کسی کو پہچانتا

تھا۔

کئی دن گزر گئے' مانک وقت پر کھانا بھی کھاتا کھیتی باڑی کا کام بھی کرتا اور سب کے چہروں کی طرف اس طرح دیکھتا' جیسے یہ سب چہرے اجنبی ہوں۔

"میں اس کی بیوی کہاں سے آئی' میں تو صرف اس کے پھیروں کی چور ہوں۔"

نئی بہو دن رات رونے لگی۔ یہ پھیروں کی چوری پچھلے مہینہ مانک کی نئی بہو اور مانک کی ماں کی امید بن گئی۔ بہو کے پورے دن تھے۔ ماں نے مانک کو بٹھا کر یہ بات سنائی' لیکن مانک نے ماں کے منہ کی طرف ایسے دیکھا' جیسے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

مانک کی سمجھ میں چاہے کچھ نہ آیا ہو' لیکن یہ بات بہت اہم تھی۔ ماں نے نئی بہو کی ہمت بڑھائی اور کہا کہ خوشی سے اس مصیبت کو کاٹ لے' جس دن تیرا بچہ مانک کی جھولی میں رکھوں گی' مانک بالکل بدل جائے گا۔

پھر وہ مصیبت بھی کٹ گئی' مانک کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ ماں نے بچے کو نہلایا دھلایا' نرم ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر مانک کی جھولی میں ڈال دیا۔

مانک جھولی میں پڑے ہوئے بچے کو دیکھتا رہا' پھر جیسے چیخ اٹھا۔

"اس کو دور کرو..... اس کو دور کرو.... مجھے اس میں سے مٹی کے تیل کی بو آتی ہے۔"

میں سب جانتا ہوں......

"دیکھو تو اس بیلدار کو' پنکھے کی طرح جھولتا چلا آ رہا ہے......"

ٹھیکیدار ذیل سنگھ نے تارا سنگھ مستری کی طرف منہ کر کے کہا' اور اپنی آواز کو نصف بالشت اوپر اٹھا کر بیلدار کو کہنے لگا' "کس کر پکڑو تسلے کو' اور قدم اٹھاؤ! تسلے کے سر کو کہیں درد تو نہیں ہوتا۔"

اور پھر ٹھیکیدار ذیل سنگھ اپنی آواز کو نصف بالشت اوپر اٹھا کر' ایک بیلدار کو نہیں' تمام بیلداروں کو کہنے لگا' "ڈھائی روپے روزانہ کے لئے منہ اٹھائے بیٹھے ہیں' پانچ بجنے نہیں دیتے' میں سب جانتا...... ہوں......"

"وہ قلیاں کہاں مر گئیں؟ میں نے ان کو اینٹیں لانے کے لئے کہا تھا۔" تارا سنگھ مستری نے منڈیر پر سے نیچے کو جھانکتے ہوئے کہا' اور دیکھا کہ دونوں مزدور عورتیں سر پر تسلوں میں ملبے کو پھینک کر کھڑی ہوئی تھیں۔

"اری چھوکری!" تارا سنگھ نے ڈانٹا۔

دونوں مزدور عورتیں ہاتھوں میں پکڑے خالی تسلوں کو لئے جب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں' تو آتے ہی تارا سنگھ مستری کے گلے پڑ گئیں' "ہمیں چھوکری بلائے ہے؟------ دیکھ تو ذرا اپنی شکل کو......"

"کیا ہو گیا میری شکل کو؟ تم سے تو اچھی ہے...... نہیں تو آئینہ لے کر دیکھ لو......"

"دیکھا بڑا شکل والا...... ہم کو چھوکری کیوں بلائے ہے؟"

"چھوکری کوئی گالی تو نہیں ہوتی۔"

"چھوٹی سی لڑکی کو چھوکری کہتے ہیں' تم ہم کو چھوکری کیوں بلائے ہے؟"

مستری نے سمجھا تھا کہ مزدور عورتوں کو چھوکری لفظ کا مطلب معلوم نہیں تھا' انہوں

نے اس کو گالی سمجھ لیا تھا' اسی لئے جھگڑ رہی تھیں۔ مگر جب اس نے سنا کہ ان کو چھوکری لفظ کا علم ہے' اور وہ اس لئے نہیں جھگڑ رہیں کہ یہ کوئی گالی ہے' بلکہ اس لئے چڑ گئی ہیں کہ مستری نے ان کو چھوٹی لڑکیاں سمجھ لیا ہے' جوان عورتیں کیوں نہیں سمجھا۔۔۔۔۔۔ تو مستری ہنسنے لگا۔

"پھول متی ہے میرا نام' اور اس کا سون متی۔" ایک نے دوسری کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ہنسنے لگیں۔

"پھول متی کیا' تم کہو تو میں پھول رانی بلایا کروں تمہیں...... مگر اینٹیں تو لادے۔"

"کیوں لاؤں جی اینٹیں؟ پہلے ملبہ اٹھانے کو کیوں کہا تھا؟ صبح سے ہم ملبہ اٹھا رہی ہیں' اب تو ملبہ ہی اٹھائیں گی..... اینٹیں منگوانی تھیں تو صبح ہی اینٹوں پر لگا دیتے......"

"میری مرضی ہے میں ملبہ اٹھواؤں' میری مرضی ہے میں اینٹیں منگواؤں۔"

"ہائے ہائے مرضی تو دیکھ اس کی۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں' دیکھ میری مرضی! میں ابھی ٹھیکیدار سے کہتا ہوں۔"

"دیکھو مستری جی! شکائتوں سے کام نہیں ہوگا' بتائے دیتی ہوں۔"

"تم کام نہیں کرو گی' تو میں شکائیت کروں گا۔"

"کام سے تھوڑا ہی بھاگتی ہوں' تم بات ہی ایسی کرتے ہو۔"

"کیا بات کی ہے میں نے؟"

"کام لینا ہو تو صبح آتے ہی اپنے بیلدار بانٹ لیا کرو! آج تم نے کلیا کو کہا تھا اینٹیں لانے کے لئے' اب کلیا سے منگوا لو۔"

"کلیا روڑی بنانے کے لئے گیا ہے۔"

"روڑی تو سیمنٹ والا بنائے گا۔ روڑی بنانا تو اسی کا کام ہوتا ہے۔"

اتنی دیر میں ٹھیکیدار نچلی کوٹھڑی میں سے سیمنٹ کی بوریاں نکلوا کر دوبارہ چھت پر آگیا تھا۔ آتے ہی تارا سنگھ مستری کو ڈانٹ کر بولا "تم نے کہاں ان کو لگا لیا۔۔۔۔۔۔۔ بالکل کائیں کائیں...... میں سب جانتا...... ہوں......"

"میرے پاس اینٹیں تھوڑی تھیں' میں نے ان کو کہا کہ دو پھیرے لگا دو' اتنے میں کلیا

آجائے گا۔ کام جاری رہے اس لئے میں نے کہا تھا۔"

"دیکھو ٹھیکیدار جی! یہ مستری ہم کو چھوکری بلائے ہے۔۔۔۔۔۔" پھول متی نے قریب سے کہا۔

"یہ قینچیاں کہاں سے پکڑ لائے تارا سنگھ! باگڑیانیوں کا کوئی جواب نہیں' کام بھی دگنا کرتی ہیں اور زبان بھی نہیں ہلاتیں۔۔۔۔۔۔" ٹھیکیدار نے مستری کی طرف سے توجہ ہٹا کر دونوں قلی عورتوں کی طرف بڑی غصیلی نظروں سے دیکھا۔ اور جو بات اس نے گزشتہ آٹھ دنوں سے نہیں دیکھی تھی' وہ بھی دیکھی کہ ان دونوں میں سے جو پھول متی تھی' اس کے پیٹ میں تقریباً چھ ماہ کا بچہ تھا۔ وہ شائد لمحہ بھر کو ستانے کے لئے جھگڑا مول لے بیٹھی تھی۔ اور ٹھیکیدار کی آنکھیں اور غصیلی ہو گئیں۔ میں سب جانتا...... ہوں ......" ٹھیکیدار نے کہا۔

"کیا جانتے ہو ٹھیکیدار جی! پھول متی نے مچل کر کہا۔

"چل چل تم کام کرو' کام تم سے ہوتا نہیں' باتیں بناتی ہے۔۔۔۔۔۔" ٹھیکیدار نے پھر پھول متی کے پیٹ کی طرف دیکھا۔

"کیا دیکھتے ہو ٹھیکیدار جی!" پھول متی نے سر کے پلو کو چہرے کی طرف کھینچا اور ہنسنے لگی۔

"تمہارا مرد کہاں ہے؟ کماتا کچھ نہیں سوہری کا؟" ٹھیکیدار نے کچھ ترس سے اور کچھ غصے سے پوچھا۔

"میرا مرد؟ وہ تو مر گیا... اب کام نہیں کروں گی تو کھاؤں گی کہاں سے؟"

"تم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ نہ اینٹیں ڈھونے کا اور نہ ملبہ اٹھانے کا۔"

"جانتی ہوں ٹھیکیدار جی! مگر کیا کروں...... کھیت پر کام کرتی تھی میں...... گوبھی کا تو اب موسم نہ رہا' بس تمباکو کا کھیت ہے' مالک ایک روپیہ دیتا ہے روز کا...... پھر بھی کرتی' مگر تمباکو کی بو بہت چڑھتی ہے۔ سر کو چکر آجائے گھڑی گھڑی کو۔۔۔۔۔" پھول متی کی آواز میں حلیمی آ گئی۔

وہ جھگڑا کرتے کرتے تسلے میں ملبہ ڈالتی رہی تھی' اب اس نے اٹو کر کے سرپور رکھا اور

ملبے سے بھرے ہوئے تسلے کو سونی متی سے اٹھواتی تارا سنگھ مستری کی طرف منہ کر کے کہنے لگی' "تم غصہ نہ کرو مستری جی! میں اینٹیں لا دیتی ہوں۔ بس یہ تسلہ ڈال دوں گی' اور اینٹیں لا دوں گی۔"

"بس اس طرح کام کیا کرو نا! درمیان میں کائیں کائیں کرتی ہے۔"

"میں کائیں کائیں کرتی ہوں؟"

"اور نہیں تو کیا! اب کی دفعہ اگر تم بولو گی' تو میں تمہارا نام کائیں کائیں رکھ دوں گا۔"

"گھر میں عورت تو ہو گی مستری جی!" سیڑھیاں اترتے وقت پھول متی نے پوچھا۔

"ہاں' ہے۔" تارا سنگھ نے چوکھٹ کو کیل ٹھونکتے ہوئے جواب دیا۔

"تو اس کا نام کائیں کائیں رکھ دے نا!" سیڑھیاں اترتی پھول متی نے زور سے کہا' اور پھر ہنسنے لگی۔

"تم نے بھائی اُس کو کیوں منہ لگالیا۔" ٹھیکیدار نے قریب سے کہا۔

"منہ تو میں نے نہیں لگایا ٹھیکیدار جی! یونہی منہ کا ذائقہ خراب کرنا تھا۔۔۔۔۔" مستری ہنسنے لگا۔

"میں سب جانتا...... ہوں...... تم توجہ سے کام کرو' آج میں نے بڑی شیلٹ ڈلوانی ہے۔۔۔۔" ٹھیکیدار نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کو یاد آیا' گزشتہ کئی ماہ سے تارا سنگھ مستری کی بیوی بیمار ہے' اس لئے ہمدردی سے پوچھنے لگا "کیوں بھائی تارا! تمہاری بیوی بیمار تھی' اب تو تندرست ہے؟"

"تندرست تو کوئی نہیں سردار جی! بیمار سی رہتی ہے' معلوم نہیں اس کو کیا بیماری ہے۔"

"کہیں ما تھکے جانے کی بیماری تو نہیں بھائی' میں جانتا...... ہوں...... ان عورتوں کو۔"

"میں نے کوئی باندھ کر تو نہیں رکھا ہوا۔"

"پھر ایک دو لگا دینی تھیں۔"

"نہ سردار جی! مجھے عورت کو مارا نہیں جاتا۔"

"نہ بھئی' مارنا بھی نہیں چاہئے..... یوں ہی کہیں رسی تڑوا لے..... بندہ اگر عورت کو مارے تو باندھ کر مارے ورنہ یونہی کبھی نہ مارے۔"

"باندھ کر کس طرح ٹھیکیدار جی؟"

"تم بھائی بات کو سمجھا کرو!"

"میں تو کچھ نہیں سمجھا۔"

ٹھیکیدار کی ہنسی اس کی گھنی مونچھوں میں پھنس گئی اور وہ کہنے لگا "گھر میں کوئی بال بچہ ہو' تو پھر چاہے بیوی کو مار ڈالو وہ کہیں نہیں جاتی میں سب جانتا...... ہوں......"

"آپ کے تو اب بچہ پیدا ہو گیا ہے ٹھیکیدار جی! کبھی یہ نسخہ استعمال کیا ہے؟" مستری کی ہنسی اس کی پتلی مونچھوں میں سے بہنے لگی۔

ٹھیکیدار نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ پھول متی ملبے والا خالی تسلہ ہاتھ میں پکڑے چھت پر آ گئی۔ نیچے اینٹوں کا ٹرک آیا تھا' ٹھیکیدار پرچی پر دستخط کرنے کے لئے نیچے چلا گیا۔

"او کائیں کائیں! تم اینٹیں نہیں لائی؟" مستری نے پھول متی کو رعب سے پوچھا۔

"جو کائیں کائیں ہو گی وہ اینٹیں لائے گی میں تو پھول متی ہوں......" پھول متی نے ایک ادا کے ساتھ کہا' اور خالی تسلے میں ملبہ بھرنے لگی۔

"اب میں تم سے بات نہیں کروں گا...... وہ آ گیا کلوا' جا کر کلوا جلدی سے اینٹیں لے آ' دیکھنا خشک اینٹیں مت لانا' تر کر کے لانا......"

"اب میں تم سے بات نہیں کروں گا......" پھول متی نے منہ چڑایا اور کہنے لگی' "تو کون بات کرتی ہے تم سے مستری جی!"

"ملبہ تو آج ہی اٹھ جائے گا۔ تم پھر کل کیا کرو گی؟ کل مت آنا کام پر۔"

"ہائے ہائے مت آنا کام پر......" پھول متی نے مستری کی نقل اتاری اور کہنے لگی "ہم تو اپنا اپنا مستری بانٹ لیں گی...... میں دوسرے مستری کو اینٹیں لا کر دوں گی۔"

"جا جا جہنم میں جا!"

"جہنم کیا ہوتا ہے مستری جی!"

"میں کہتا ہوں تم یہاں سے چلی جاؤ' نہیں تو میں ابھی تم کو جہنم دکھاؤں گا۔"

"بڑے آئے جہنم دکھانے والے۔۔۔۔۔۔ لو بیٹھی ہوں تمہارے سامنے......"

"آتا ہے ٹھیکیدار' ابھی تم کو سیدھا کرے گا۔"

"کیا کرے گا ٹھیکیدار' مارے گا مجھے؟ محنت کر کے کماتی ہوں' کھاتی ہوں' میں ٹھیکیدار کا نہیں کھاتی' جس کا کھاتی تھی' میں نے اس کو چھوڑ دیا......"

"تو تو کہتی تھی' تیرا مرد مر گیا ہے"۔

"جب چھوڑ دیا تو پھر کیا ہے' وہ جیتا بھی ہے تو مجھے کیا....."

"تم نے اپنے مرد کو کیوں چھوڑ دیا؟"

"بہت شراب پیتا تھا' مجھ کو مارتا تھا' ایک دن بہت مارا....."

"کچھ تیرا بھی قصور ہو گا....."

"اس نے میرے سارے زیور فروخت کر دیئے' میں نے اعتراض کیا تو مارنے لگا....."

پھول متی ملبے کے بھرے ہوئے تسلے کو سر پر اٹھاتی کچھ اور بھی کہنے لگی تھی کہ ٹھیکیدار چھت پر آگیا اور آتے ہی کہنے لگا' "تمہیں اجاڑ دیا باتوں نے..... بھائی تارا! ستون نو انچ کا لگانا تھا۔"

"نو انچ کا تو لگایا ہے ٹھیکیدار جی!"

"اچھا اچھا' میں نے کہا کہ تم باتوں میں..... آج یہ بڑی شیلف ضرور ڈالنی ہے' ذرا ہاتھوں کو جلدی جلدی چلاؤ۔"

"سریا چار انچ پر لگانا ہے کہ تین انچ پر؟"

"چار انچ پر بھائی چار انچ پر۔ لوہے کو تو آگ لگی ہوئی ہے۔ تین انچ کا بھلا یہاں کیا کام ہے۔"

"آپ روڑی منگوائیں' میرے دو پھیرے رہ گئے ہیں' اور دوسرے مستریوں کو اس طرف بلا لیں۔"

"نیچے بھائی ایک انچ کی روڑی ڈال دینا' پھر سریا بچھا کر ایک ایک انچ کی اور ڈال دینا۔ بس اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔"

"اچھا بھائی!"

"ہاں بھائی' تم خود سیانے ہو' مالک کام تو کہتے ہیں اول درجے کا ہو' مگر پیسے ادا کرتے وقت بغلیں جھانکتے ہیں۔ میں سب جانتا.... ہوں....."

"آپ کو کرنل والی کوٹھی کے پیسے وصول ہوئے یا نہیں؟"

"کہاں سے' بھائی وہاں تو اور ہی معاملہ بن گیا....."

"کیا ہو گیا وہاں؟"

"وہاں ساتھ ہی ایک اور کوٹھی بھی بن رہی تھی نا....."

"ہاں جی۔"

"بس بھائی' ان کی آپس میں لگ گئی....."

"لڑائی ہو گئی ان کی؟"

"لڑائی کس لیئے ہو گئی' ان کا آنا جانا ہو گیا۔"

"پھر؟"

"کرنل کو اندر ہی اندر شک ہو گیا' اس نے کوٹھی اپنے نام کروالی...."

"پہلے اس کی بیوی کے نام تھی؟"

"زمین کا بیعانہ اس کے نام کا ہی دیا تھا بھائی۔"

"پھر؟"

"بیوی کو جب علم ہوا' اس نے مقدمہ کر دیا..... وہ جو انکل تھا نا' اس نے اکسایا تھا۔"

"انکل کون ٹھیکیدار جی؟"

"اوئے' تم بات سمجھا کرو' وہ بیوی کا انکل نہیں تھا' اس کے لڑکے لڑکیاں اس کو انکل کہہ کر بلاتے تھے۔"

"انکل..... اچھا انکل....."

"بھئی' ہم پڑھے ہوئے نہیں' لیکن اتنا ہم اس وقت ہی جان گئے تھے' کہ یہ جو نیا انکل بنا ہے' کوئی مصیبت ہی ڈلوائے گا....."

"پھر؟"

"پھر جی وہ عورت کچہری چلی گئی یہ کچہریوں کے معاملے بڑے برے ہوتے ہیں....."

"پھر کیا بنا؟"

"ان کو معلوم نہیں کیا بنے گا' مگر میں تو مارا گیا بھائی' نہ وہ بی بی میرے بل ادا کرتی ہے' اور نہ وہ کرنل صاحب۔"

"بل تو اب ٹھیکیدار جی انکل کو ادا کرنا چاہئے....."

"میں سب جانتا .... ہوں ..... ان انکلوں کو' یہ سالے بل ادا کریں گے ..... کرنل کو چاہئے تھا کہ بیوی کو پہلے ہی تاڑ کر رکھتا....."

مستری نے ہاتھ والا کام ختم کر لیا تھا' اس لئے ٹھیکیدار نے منڈیر سے جھانک کر بیلدار کو آواز دی کہ وہ روڑی کے تسلے بھر کر لے آئیں۔

"پانچ تو بج گئے ٹھیکیدار جی' اب شیلف کیسے پڑے گی؟" پھول متی نے چھت پر آتے ہوئے کہا۔

"تم نے کلائی پر گھڑی باندھی ہوئی ہے؟ ابھی پانچ کہاں بجے ہیں!"

"میں تو ٹھیکیدار جی بغیر گھڑی کے بتا دوں' تم دیکھ لو گھڑی میں۔"

"تم تو صبح بھی مٹک کر آتی ہو ..... تم سے تو میں چھ بجے تک کام کراؤں گا .... میں جانتا ..... ہوں....."

شیلف پڑ گئی۔ چھ بجنے کے قریب ہو گئے۔ ٹھیکیدار نے مستریوں اور بیلداروں کو تاکید کی کہ وہ صبح آٹھ بجے سے دس منٹ پہلے ہی پہنچ جائیں۔ دس منٹ اوپر نہ ہونے دیں۔ کل سے دیواریں شروع کر کے پرسوں ساری دیواروں کو چھت تک پہنچا دینا تھا۔

صبح آٹھ بج گئے' نو بج گئے' دس بج گئے' کام شروع ہو گیا تھا مگر سارے مستری اور بیلدار حیران تھے کہ ٹھیکیدار ابھی تک نہیں آیا تھا۔

کل چاہے پھول متی نے کہا تھا کہ تارا سنگھ مستری کو اینٹیں نہیں دے گی' مگر جب آج سب بیلداروں نے اپنے اپنے مستریوں کا انتخاب کیا تو پھول متی نے تارا سنگھ مستری کو منتخب کر لیا۔

"آج تو مستری جی مجھے ڈر آتا ہے ....." پھول متی نے سر پر اٹھائی ہوئی اینٹوں کو نیچے مٹی کے ایک ڈھیر پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"کسی بات کا ڈر پھول متی؟"

"آج ٹھیکیدار کو جیسے کوئی مصیبت پڑ گئی ہے۔"

"کسی کام سے گیا ہوگا' ابھی آتا ہوگا....."

آج تو میرا دل کہتا ہے کوئی بری بات ہوگی۔"

کام جاری تھا۔ ایک ٹھیکیدار نہیں آیا تھا' ساری رونق بجھی بجھی سی تھی۔ آج پھول متی بھی مستری سے نہیں جھگڑ رہی تھی۔ کھانے کے وقت تک سب کو ٹھیکیدار کے آنے کی امید بندھی رہی' لیکن اس کے بعد تارا سنگھ مستری کے منہ سے بھی وقفے وقفے کے بعد نکلنے لگا' "آج معلوم نہیں ٹھیکیدار کو کیا ہوا' وہ رہنے والے نہیں تھا۔"

آج دیواروں کا کام شروع تھا کل تک دیواریں مکمل ہو جانی تھیں۔ چھت باندھتے وقت ٹھیکیدار کا موجود ہونا ضروری تھا۔ اس لئے تارا سنگھ نے سب کو کہا کہ وہ رات کو ٹھیکیدار کے گھر جائے گا اور معلوم کرے گا کہ کیا بات ہو گئی تھی۔

اگلے دن صبح جب سارے مستری اور بیلدار کام پر پہنچے تو ٹھیکیدار ابھی بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب تارا سنگھ مستری کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ "ٹھیکیدار آئے گا' ابھی تھوڑی دیر کے بعد آئے گا۔ ہم کام شروع کریں گے' وہ کچھ بیمار ہے۔"

تارا سنگھ مستری نے سب کو یہی بات کہی' مگر اس کے چہرے سے نظر آ رہا تھا کہ بات کچھ اور تھی۔

پھول متی کچھ دیر تک تارا سنگھ کو خاموشی سے اینٹیں پکڑاتی رہی۔ پھر آہستہ سے پوچھنے لگی' "کیا بات ہو گئی مستری جی!"

"بات..... بات تو کچھ نہیں" مستری نے بات ٹال دی۔

دوپہر کو جب کھانے کی چھٹی ہوئی' تو نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر روٹی کھاتے تارا سنگھ مستری کو پھول متی دوبارہ پوچھنے لگی' "ہم کو نہیں بتاؤ گے مستری جی؟"

"بتا تو دیا کہ ٹھیکیدار بیمار ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہو مستری جی!"

"میں جھوٹ بولتا ہوں' تو تم ٹھیکیدار کے گھر جا کر پوچھ لو۔"

"تمہاری مرضی مستری جی! ہم نے کیا کرنا ہے پوچھ کر..... یہ تو ایسے ہی..... کسی کے دکھ سے دکھ لگے....."

مستری کچھ دیر تک پھول متی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر پھوٹ پڑا" "بات بڑی خراب ہے پھول متی! کسی کو بتانی نہیں....."

پھول متی کچھ نہ بولی' اس نے صرف انکار میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیکیدار کی عورت....." مستری کچھ کہتا پھر رک گیا۔

"بھاگ گئی؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں' کہاں گئی' مگر گھر میں نہیں ہے۔ شاید ٹھیکیدار سے روٹھ کر اپنے ماں باپ کے ہاں چلی گئی ہو گی۔"

"اس کا بچہ نہیں ہے؟"

"بچہ تو ہے۔"

"وہ بچے کو ساتھ لے گئی؟"

"نہیں' بچے کو چھوڑ گئی ہے۔"

"پھر وہ ماں باپ کے ہاں نہیں گئی ہو گی۔"

تارا سنگھ مستری ابھی تک واقعی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ شاید ٹھیکیدار سے ناراض ہو کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی ہو گی۔ مگر پھول متی کی دلیل اس کو ٹھیک لگی' کہ اگر وہ اپنے ماں باپ کے پاس گئی ہوتی تو بچے کو اپنے ساتھ لے جاتی۔

"ٹھیکیدار نے جھگڑا کیا تھا؟"

"جھگڑا تو ہوا ہی ہو گا' شاید ٹھیکیدار نے اسے مارا ہو گا------"

"ٹھیکیدار شراب پیتا ہے؟"

"شراب تو نہیں پیتا مگر وہ سوچتا ہے کہ کبھی کبھی عورت کو مارنا ضرور چاہئے۔"

"بے قصور کو مارنا چاہئے؟"

"وہ سوچتا ہے کہ اس طرح عورت خراب نہیں ہوتی..... دو دن ہوئے کہہ رہا تھا کہ عورت کو مارنا ہو تو باندھ کر مارنا چاہئے..."

"رسی سے باندھ کر؟"

"نہیں نہیں' اس کا مطلب تھا کہ جب گھر میں کوئی بال بچہ ہو جائے' تو عورت گھر سے بندھ جاتی ہے۔ پھر اس کو مار پیٹ بھی کرو تو وہ گھر کو چھوڑ کر بھاگتی نہیں ------"

"ایک بات کہوں مستری جی؟"

"کہو!"

"ٹھیکیدار تو کہتا ہے' میں سب بات جانتا ہوں..... وہ خاک جانتا ہے....." تارا سنگھ مستری نے دیکھا کہ سامنے سے ٹھیکیدار آ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر سب سے پہلے ٹھیکیدار کو ملا اور دور سڑک پر کھڑے ہو کر اس سے پوچھنے لگا "کچھ پتہ چلا؟"

ٹھیکیدار نے جواب دینے کی بجائے انکار میں سر ہلا دیا۔

"مائیکے تو وہ نہیں گئی' میرا دل گواہی دیتا ہے' ویسے آپ نے آدمی بھیجا ہی ہوا ہے' آج آ کر خبر دے دے گا۔"

"آدمی واپس آ گیا ہے' وہ وہاں نہیں گئی۔" ٹھیکیدار کی آواز حلق میں سے کئی بالشت نیچے اتری ہوئی تھی۔ "ارد گرد کے کنوؤں میں بھی تلاش کرا لیا ہے....."

"آپ کیا سوچتے ہیں کہ اس نے کسی کنوئیں میں ------"

"کہا کرتی تھی ---- میں کسی دن کنوئیں میں چھلانگ لگا کر مر جاؤں گی ---- بھائی مجھے کیا علم تھا....." ٹھیکیدار ذیل سنگھ کی زندگی میں یہ شاید پہلا دن تھا جب اس نے یہ نہیں کہا تھا' میں سب جانتا..... ہوں......

پگھلتی چٹان

رات کا چوتھا پہر تھا' شاید ابھی چوتھا بھی نہیں تھا' کیونکہ شیو مہو پربت کی چوٹی پر بنے مندر کی پوجا کرنے والے' چوتھے پہر اس پگڈنڈی پر پڑ جاتے ہیں' مگر ابھی اس پگڈنڈی پر راج شری کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ پتھریلی چٹانوں کو چیرتی یہ پگڈنڈی تھی---- اور اس پگڈنڈی کے ساتھ باتیں کرتے راج شری کے قدم تھے.....

اور راج شری کو محسوس ہوا---- جیسے اس پگڈنڈی اور اس کے قدموں کی باتیں بہت لمبی تھیں' بہت پرانی' شاید دو سو سال پرانی..... پربت کی چوٹی پر بنا مندر جب راج شری کی آنکھوں میں چمکا' اس نے آنکھیں جھپکا کر مندر کی چمک سے چہرہ موڑ لیا اور اس کے پچھواڑے کی طرف سے بیگا ندی کی طرف وہ پربت سے نیچے اترتی پگڈنڈی پر چل پڑا.....

اب بھی قدموں کے نیچے شیو مہو پربت کی پگڈنڈی تھی---- مگر چڑھائی کی طرف جاتی نہیں' اترائی کی طرف اترتی.....

اور اچانک راج شری کے پاؤں ایک چٹان کے قریب' جیسے اس چٹان کو تھام کر کھڑے ہو گئے..... "میں کہاں جا رہی ہوں؟" ---- راج شری کا دل زور سے دھڑکا۔ یہ بات شاید اس نے دل سے ہی پوچھی تھی۔ دل نے ایک دفعہ بیگا ندی کے اس راستے کی طرف دیکھا---- جو ندی کے اس بھیانک موڑ کی طرف جاتا تھا' جہاں پانی کا بہاؤ ہمیشہ ایک بھنور بنا ہوتا تھا' اور پھر ہنس کر کہنے لگا---- "وہاں ہی' جہاں دو سو سال ہوئے تمہاری نسل کی ایک کماری رتن راج لکشمی گئی تھی....."

راج شری نے گھبرا کر ارد گرد کی چٹانوں کی طرف دیکھا۔ اوپر نیچے ہر طرف چٹانیں تھیں---- پتھر کی چٹانیں' اور وہاں اس راستے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک حسرت سی بھر آئی---- "پاؤں کے لئے صرف ایک ہی راستہ' کوئی اور

راستہ کیوں نہیں؟..... اس پربت پر صرف ایک ہی راستہ کیوں بنا؟....."

راج شری کے پتلے گورے بازو جیسے ایک چٹان کو ہزاروں برس کی نیند سے جگا کر کچھ پوچھ رہے ہوں، مگر وہ چٹان اس کے بازوؤں کو گلے کے ساتھ لگا کر بھی یوں خاموش تھی---- جیسے اس کے پاس کوئی جواب نہ ہو.....

"رکسی! ٹھوس پربت میں سے ایک ملائم سی آواز آئی۔

راج شری نے پھول کی ایک ڈنڈی کی طرح کانپ کر دیکھا---- اس سے کچھ فاصلے پر وہی کھڑا تھا، جس کو وہ پورے چالیس دنوں سے روزانہ اس پربت کے طواف میں دیکھا کرتی تھی۔

"رکسی! مجھے دو باتیں کرنے کی تو اجازت دے دو!" وہ جو دور کھڑا تھا، وہاں ہی کھڑا رہا، صرف اس کی آواز چلتی آہستہ سے اس کے پاس آئی۔

راج شری کی سفید دھوتی کا رنگ جیسے رات کے چوتھے پہر میں گلابی سا ہو گیا۔ مگر اس نے دھوتی کے سفید رنگ جیسی اداس اور سرد آواز میں جواب دیا "میرا نام رکسی نہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تمہارا کیا نام ہے۔ میں نے صرف یہاں کی رکسی پی ہے۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے---- تم اس دھرتی کی رکسی سے بھی زیادہ کوئی چیز ہو....."

"رکسی صرف چاولوں کی ہوتی ہے۔"

"لیکن اگر کوئی دھرتی کی مٹی کی شراب بھی ہو سکتی ہے، تو وہ تم....."

"میں....."

"تمہیں دیکھا، تو میں اس دھرتی سے لوٹ نہ سکا....."

"تم....." راج شری کی آواز رات کے چوتھے پہر کی ہوا کی طرح اور ملائم بھی ہو گئی مگر اور سرد بھی۔ کہنے لگی، "تم جس دیس سے آئے ہو، لوٹ جاؤ.... نہیں تو....."

"نہیں تو؟"

"پردیسی!"

"میرا نام کمار ہے۔"

"اچھا راج کمار!"

"میں راج کمار نہیں' صرف ایک عام کمار ہوں۔"

"لیکن تو ارنج..... " راج شری کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مگر پھر صبح کی لہراتی ہوا کی طرح کہنے لگی' "تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

کمار نے کسی پھول کی پہلی کھلتی پتی کی طرح کہا------ "اس مٹی کی بیٹی------اس مٹی کی شراب۔"

راج شری نے پیٹھ کو چٹان کا سہارا دیا ہوا تھا' لیکن اس کو محسوس ہوا کہ اس وقت ہر سہارے کو چھوڑنا ہے۔ سیدھی کھڑی ہو کر تن کر کہا------

"میں کماری ہوں تمہیں معلوم ہے------ ہمارے دیس میں کماری کیا ہوتی ہے؟"

"نہیں!"

"نیچے------ کٹھمنڈو کی وادی میں جا کر کسی سے پوچھو!"

"اور کسی سے نہیں' جو پوچھنا ہے صرف تم سے۔"

"میں ساکیے نسل سے ہوں' بودھیاں کی بندنیئے نسل میں سے' باندیاں میں سے۔"

"پھر؟"

"میری نسل میں جس لڑکی کے روپ میں بتیس خصلتیں ہوں....."

"وہ میں دیکھ رہا ہوں------ تم میرے سپنوں سے بھی خوبصورت....."

"لیکن میری نسل میں اس طرح کی لڑکی جب سات برس کی ہوتی ہے' کماری منتخب ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہیں شاید میری دھرتی کی تاریخ نہیں معلوم۔ یہاں کا راجہ صرف راج کا نمائندہ ہوتا تھا------ راج اصل میں کماری کا ہوتا تھا۔ وہ کماری گھر میں رہتی تھی' اور راجہ اس کی پوجا کر کے راج کا کام سنبھالتا تھا....."

"مگر یہ قدیم زمانے کی بات ہوگی....."

"ہاں مگر نشانی کے طور پر اب بھی ہے۔ اب بھی میری نسل کی لڑکی کماری منتخب کی جاتی ہے' جب تک وہ جوان نہیں ہوتی۔"

"پھر؟"

"وہ جب جوان ہو جاتی ہے' کماری نہیں رہتی۔ اس کی جگہ دوسری کماری کا انتخاب کیا جاتا ہے..... اور دیس کا راجہ اب بھی اس کی پوجا کرتا ہے..... اس کے ماتھے پر کماری تلک لگاتی ہے....."

"مگر تم..... اب......"

"اب میں کماری نہیں' مگر کماری تھی۔"

"میری محبت کو تمہارے ماضی سے واسطہ نہیں--- تم جو بھی تھی....."

"مگر تمہیں علم نہیں..... ایک بات بتاؤں؟--- میں آج اتنی رات کے وقت اس مندر میں پوجا کرنے آئی تھی' مگر نہیں کر سکی....."

"کیوں؟"

"میں اپنے ساکیہ نسل کے بدھ سے اپنا آپ مانگنے آئی تھی' میرا اپنا آپ....." راج شری نے چٹان کی طرف دیکھا' کہا "کماری ایک چٹان ہوتی ہے' جو پگھلتی نہیں' مگر میں' کئی دنوں سے محسوس ہو رہا تھا' جیسے پگھل رہی ہوں...... تمہیں دیکھ کر..... روزانہ تمہیں اس پربت کے طواف میں دیکھتی تھی......" راج شری کچھ اس طرح اداس ہو گئی' جیسے صبح طلوع ہونے سے پہلے رات اور گہری ہو جاتی ہے۔ کہنے لگی "اپنا آپ ہاتھوں سے گم ہو رہا ہے..... مگر مندر کے قریب آ کر بھی میں مندر کے اندر نہیں گئی--- سوچتی ہوں اپنے آپ کو ہاتھ میں پکڑ کر بھی کیا کروں گی؟"

کمار کے پاؤں اس کے دل کی طرح دھڑک پڑے۔ وہ کچھ آگے بڑھ کر راج شری کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔ آہستہ سے پھول میں سے آتی مہک کی طرح کہنے لگا---

"کماری!"

"کماری نے ساری عمر کماری رہنا ہوتا ہے....." راج شری نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کو اس طرح سے ڈھانپا--- جیسے مردانہ مہک میں سانس لینے سے ڈرتی ہو۔ کہنے لگی--- "یہ کماری راج کا قانون نہیں--- مگر کوئی آدمی کسی کماری سے شادی نہیں کرتا--- کرے تو مر جاتا ہے۔"

"مجھے مرنا منظور ہے....." کمار نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں راج شری کی دونوں ہتھیلیوں پر جیسے پھولوں کی طرح رکھ دیں۔

راج شری نے گھبرا کر اپنے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹائے۔ کہنے لگی' "اس دھرتی پر پہلے قوت کا راج ہوتا تھا۔ سیو تکالی جب یہاں کی رانی ہوا کرتی تھی' اس وقت اس دیس پر حملہ ہوا۔ نجومیوں نے کہا کہ سیو تکالی کی بیٹی کماری کے ہاتھوں اگر دشمن کا جوان بیٹا قتل ہو' تو اس دھرتی کی جیت ہو گی۔ مگر کماری نے جب اس حملہ آور کو دیکھا---- اس کو..... اس کو....." راج شری نے پہاڑی ہوا کی طرح کانپ کر کمار کے چہرے کی طرف دیکھا' پھر ایک چٹان کی اوٹ میں ہو کر کہنے لگی---- "محبت اور دشمنی میں لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ مگر سیو تکالی نے اپنی بیٹی کو حکم دیا کہ وہ اس کا قتل کرے۔ اس نے قتل کیا۔ حملہ آور ہار گئے۔ کماری کو دیس کی رانی بنایا گیا' اور اس کا تخت جہاں سجایا گیا' وہاں تخت کے نیچے اس آدمی کے دونوں ہاتھ' دونوں پاؤں اور تلوار سجائی گئی' جس کو اس نے پیار کیا تھا....."

کمار نے آہستہ سے راج شری کے پاؤں کے قریب زمین پر بیٹھتے---- اپنے دونوں ہاتھ زمین پر بچھا دیئے' کہا---- "اگر ہر کماری کی یہی شرط ہے تو....."

راج شری نے اڑ کر کمار کے دونوں ہاتھ چھوئے' اور ہاتھوں کا سہارا دے کر اوپر اٹھائے۔ کہنے لگی' "مگر عورت کی محبت راج کے تخت سے بھی بڑی ہوتی ہے۔ اس کماری نے راج کیا' مگر شادی نہیں کی۔ جس کو قتل کیا تھا' اسی کو یاد کرتی رہی۔ کماری گھر بنا اور وہاں ہی یہ یقین کہ کوئی کماری جب بھی کسی کے ساتھ شادی کرے گی' وہ زندہ نہیں رہے گی....."

"مگر کماری! ایک وقت کا سچ ہر وقت کا سچ نہیں ہوتا....."

"معلوم نہیں....." راج شری نے پربت کے پچھواڑے سیکا ندی کی طرف اترتے راستے کی طرف دیکھا اور کہنے لگی' "میری نسل میں میری طرح ایک رتن راج لکشمی ہوئی تھی..... میری طرح ہی کماری منتخب ہوئی' ہاتھوں میں راجے کے بھجوائے ہوئے کنگن پہنے' بدن پر سرخ لہنگا' ماتھے پر سیندور کا لیپ' اور جب میری طرح جوان ہو گئی اس کو کماری گھر میں سے واپس اس کی والدہ کے گھر بھیج دیا گیا---- وہ کئی برس اسی شیو مہو پربت پر گھومتی رہی' اور پھر ایک دن اس پربت کے پچھواڑے والی ندی میں ڈوب گئی....."

"کیوں؟" کمار نے کانپتی انگلیوں سے راج شری کے کندھے کو چھوا۔

"شاید..... شاید اس کو کوئی کمار اچھا لگا تھا....." راج شری نے کہا اور ذرا سا دور ہٹ کر پربت سے نیچے اترتے راستے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر کہنے لگی---- "دو سو سال سے ہمارے قدموں کے لئے یہی راستہ بنا ہوا ہے....."

"نہیں---- نہیں-----" کمار نے آگے بڑھ کر راج شری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ راج شری نے ایک ندی کی طرح گہرا سانس لیا' اور کہنے لگی' "جب کسی لڑکی کو کماری بنایا جاتا ہے' اس کے ماتھے پر سونے چاندی کی ایک آنکھ لگائی جاتی ہے---- تیسری آنکھ۔ اس کو ہم نظر کہتے ہیں۔ اس میں واقعی کوئی قوت ہوتی ہے۔ اس وقت دل کی طاقت کبھی نہیں جھولتی۔ مگر اب..... اب ان دونوں عام آنکھوں سے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا....."

کمار نے آگے بڑھ کر راج شری کو بالکل قریب کر کے اس کے ماتھے کو چوما----- "یہ ایک مرد کا سارا اقرار---- تیسری آنکھ۔" اور کمار نے راج شری کو ندی کی طرف موڑتے کہا---- "کیا اس تیسری آنکھ سے بھی اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا؟ زندہ رہنے والا راستہ.....؟"

راج شری نے---- سامنے ایک پربت جیسے مرد کو دیکھا' پھر ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کی چھاتی کو یوں چھوا---- جیسے زندہ رہنے والا راستہ تلاش کر رہی ہو۔ اور کہنے لگی' "جب سات برس کی بچی کو کماری منتخب کرتے ہیں' پہلے ساری رات ایک کمرے میں جانوروں کے کٹے ہوئے سر رکھ کر اس لڑکی کو کمرے میں بند کر دیتے ہیں۔ اگر وہ ساری رات نہ گھبرائے' تو اس کو کماری منتخب کرتے ہیں..... مگر ایک وقت آتا ہے..... عمر کا وقت..... جب وہی کماری اپنے آپ سے گھبرا جاتی ہے....."

کمار نے راج شری کو بھینچ کر سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور صبح کی پہلی کرن ہزاروں چٹانوں میں کھڑی ایک پگھلتی چٹان کو دیکھنے لگی.....

دھنو

یہ اس وقت کی بات ہے---- جب سفید روپیہ چاندی کا ہوتا تھا۔ اور گاؤں دیہات میں اٹھنیوں کو دھیلی کہتے تھے' اور چونیوں کو پولی۔ اور دھنوماسی کہا کرتی تھی ''عورت کو تو خدا نے شروع سے ہی دھیلی بنایا ہے۔ روپیہ ڈبل تو کوئی قسمت والی ہوتی ہے' جس کو مرضی کا خاوند مل جائے۔ مگر وہ تو کسی نے دیکھی نہ سنی۔ گھر گھر دھلیاں ہی دھلیاں ہیں---- بس دو تین پولیاں پیدا کیں' اور دنیا سے گزر گئیں..... ''

''کتنا منہ پھٹا ہوا ہے دھنو کا۔'' کبھی کوئی پیٹھ پیچھے یہ بات کہہ دیتی' لیکن دھنو کے سامنے گاؤں کی تمام عورتیں دانتوں تلے زبان دبائے رکھتیں۔ سب کو یاد تھا کہ ایک دفعہ شاہوں کی کیسرو نے یہی بات دھنو کے منہ پر کہی تھی' تو دھنو نے اس کی وہ پھٹکار کی تھی' کہ رہے اللہ کا نام۔ کہے '' دھیلی تو رات کو بھن کیسرو تمہاری بھی یوں ہی ٹوٹتی ہے' جیسے کہ میری۔'' اور پھر دھنو نے گاؤں کی ایک ایک عورت کی کیفیت بیان کردی تھی ''وہ دیکھو تو نمبرداروں کی ایشرو' میرے سامنے جس کے بوڑھے خاوند سے دھیلی نہیں ٹوٹتی' اور وہ سانڈ جیسے دیور سے دھیلی تڑواتی ہے..... اور چیمو کی بلونتو کس کو بھولی ہوئی ہے' بڑے غرور سے ڈولی سے اتری تھی اور سات ماہ کے بعد لڑکے کو جنم دے دیا..... اور وڑاپچوں کی کرتارو' جس نے چار برس سے مرد کا چہرہ نہیں دیکھا تھا اور میتھرے ابال ابال کر پیتی تھی۔..''

اور دھنو کو جن عورتوں کی کیفیت معلوم نہیں تھی' اس نے ان کی کنواری لڑکیوں کے نام گن دیئے تھے '' تم بڑی سیانی بنی پھرتی ہو' اپنی چھلو کو سنبھالو' جو سندھوؤں کے جگتارے سے دھیلی تڑوانے کو پھرتی ہے..... اور تم دھرمنے! کوٹھے جتنی دیرو کا بیاہ کیوں نہیں کرتی' جو گوردوارے کے بھائی کے ساتھ کندھا رگڑتی ہے..... اور..... اور...... ''

گاؤں کی عورتیں توبہ توبہ کر اٹھی تھیں اور پھر کبھی کوئی دھنو کے منہ کے سامنے نہیں

بولی تھی۔ ویسے بھی ان کو دھنو سے غرض ہوتی تھی۔ جس کے لڑکے یا لڑکی کو گلے پڑ جاتے' وہ بنفشہ اور سونف ابال کر پلاتی' مگر مہینہ مہینہ بچوں کے گلے پڑے رہتے۔ بچوں کے حلق سے لقمہ نہ اترتا' بخار چڑھ جاتا' اور عورتیں ہار کر بچوں کو انگلی سے لگائے دھنو کے دروازے پر جاتیں' "لو بھئی ماسی کو کہو تمہارا اگلا ملے۔" اور دھنو گرم گھی میں ایک انگوٹھا اور ایک انگلی ڈبو کر جس بچے کا گلا ملتی' وہ دوسرے دن بالکل تندرست ہو جاتا۔

"گلے مداناں ملے۔" دھنو جب ہنس کر کہا کرتی تھی' تو معلوم ہوتا تھا کہ دھنو کھتریوں مدانوں کے گھرانے سے تھی۔ ویسے نہ کسی نے اس کے ماں باپ کو دیکھا تھا' اور نہ ہی کسی رشتے ڈار کا علم تھا۔

صرف زبان خاص و عام تھا کہ دھنو کسی کھاتے پیتے گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس پر بھرپور جوانی آئی تھی' اس عمر میں اس نے کسی کے ساتھ آنکھیں چار کرلیں تھیں۔ لیکن اس کے ماں باپ کے گھر سے نکال کر لانے والے کوئی بدقماش نوجوان تھا' جو دس بیس دن اس کے ساتھ گزار کر اس کو کہیں فروحت کرنے کی فکر میں تھا' کہ دھنو نے منہ پھاڑ کر کہہ دیا تھا' "اگر پلو سے بندھی ہوئی دھیلی تڑوا کر روٹی کھانی ہے تو جاتی دفعہ تمہاری جیب کیوں بھر کر جاؤں----" اور وہ دبنگ ہو کر اس کو پاؤں سے کانٹے کی طرح نکال آئی تھی۔ نہ اس کو پیدا کرنے والوں کا اس سے ناطہ رہا تھا اور نہ ہی اس کو بھگا کر لانے والا کا۔

اور پھر---- کہتے ہیں کہ کسی گاؤں کے مربعوں والے نے اس پر فریفتہ ہو کر اس کو گھر ڈال لیا تھا' لیکن اس کے گھر میں جب اس کے بیٹوں نے ڈانگ سوٹا کھڑکا دیا' تو اس نے بیٹوں سے چوری دور کے اس گاؤں میں دو کھیت خرید کر اس کے نام لگوا دیئے تھے' اور اس کو ایک علیحدہ گھر دیا تھا۔ جب تک زندہ رہا اس کی خبر لیتا رہا۔ مگر وہ بھی عرصہ ہوا مر گیا تھا' اور دھنو اکیلی اپنے بل جیتی تھی۔

ویسے وہ اپنے منہ کہہ لیتی تھی' "کس بات کی فکر ہے بے بے! دھیلی پلو سے بندھی ہوئی ہے' تنگی آئی' تو تڑوا لوں گی۔" لیکن ایک دفعہ ایک نوجوان نے جب دھنو کے بازو پر چٹکی بھر کر کہا تھا' "دھیلی تو دکھاؤ کس طرح کی رکھی ہوئی ہے۔" تو دھنو نے اس کے گلے کے کنٹھے کو ہاتھ ڈال کر کہا تھا "چل دکھاؤں---- تمہاری ماں کی شلوار میں ہے....." اور اس کے بعد

گاؤں کے کسی آدمی کو جرات نہیں ہوئی کہ وہ دھنو کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ لیتا۔ اور دھنو دبنگ بن کر زندہ تھی۔

اب چاہے عمر سے ڈھل رہی تھی، مگر اس کے ناک کا لونگ ابھی بھی اس کے مزاج کی طرح چمک رہا تھا۔ آنکھیں سامنے کھیتوں میں ہل چلا رہی تھیں، اور کھترانی ہو کر بھی وہ جٹی اکڑ سے جیتی تھی۔

ایک بار دھنو کو معیادی بخار ہو گیا، ویسے اکیسویں دن اتر گیا، لیکن دھنو کا شاید اپنی عمر پر یقین کم ہو گیا تھا۔ وہ ایک دن قریبی شہر میں گئی اور اپنی زمین کے کاغذات وغیرہ لے گئی۔ بات اڑتی اڑتی کہ دھنو نے اپنی زمین کا وصیت نامہ لکھ دیا ہے۔

"اری کس کے نام لکھی ہے؟" گاؤں کی عورتیں آپس میں گھسر پھسر کرتیں۔ لیکن دھنو سے پوچھنے کا ان میں حوصلہ نہیں تھا۔

گاؤں کی ایک لڑکی سیمو کو کچھ حوصلہ ہوا۔ گزشتہ دنوں ایک شام سیمو کھیتوں میں سے واپس آ رہی تھی۔ کہ نمبردار کا شراب میں دھت بیٹا اس کو راستے میں روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرف سے کہیں دھنو بھی گزر رہی تھی، کہ سیمو نے اس کو دیکھ کر زور سے آواز دی تھی، "ماسی دھنو!" اور دھنو چھاتی کے زور اس کو جا ملی تھی۔ اور لڑکی خیریت سے گھر پہنچ گئی تھی۔

سیمو نے اسی دن کے حوصلے پر ایک دن دھنو سے آ پوچھا "اری ماسی! سنا ہے، تم نے اپنی زمین کسی کے نام کر دی ہے۔"

دھنو کرخت ہو گئی، "آ بھانجی! تمہیں ماسی کی یاد آ گئی، تمہاری ماں اور میں جڑواں پیدا ہوئی تھیں، تبھی میں تمہاری ماسی ہوئی ناں۔"

اور سیمو کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ وہ گھبرا سی گئی، کہنے لگی، "غصہ کیوں کرتی ہو ماسی! لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنی زمین گوردوارے کے نام کر دی ہے۔ میں نے تو یوں ہی پوچھا تھا۔ ویسے تو تم نے نیک کام کیا ہے۔"

دھنو شعلے کی طرح بھڑک اٹھی "گوردوارے کا بھائی بھیڑیا پہلے ہی بہت سارا حلوہ کھاتا ہے، اس کے حلوے مانڈے کے لئے تمہاری مائیں جو ہیں۔ یہ تمہاری ماسی اس طرح کا نیک کام نہیں کرتی۔"

اور سیمو کان لپیٹ کر چلی گئی تھی۔ اور پھر دھنو سے کچھ پوچھنے کی کسی نے جرات نہیں کی تھی۔

دھنو نے جیسے اپنی قسمت معلوم کر لی تھی' شاید اپنی عمر کے دن بھی معلوم کر لئے تھے۔ اس کو کچھ دنوں کے بعد پھر معیادی بخار چڑھ گیا۔ اس دفعہ سارے گاؤں کو اس کے بچنے کی امید ختم ہو گئی۔

ایک دن گاؤں کی ایک سیانی عمر کی عورت نے ہمت باندھی۔ اس عورت کو گاؤں والے جیوی بھگتنی کہتے تھے۔ چھوٹی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی اور بڑی ہمت اور طاقت سے زندہ تھی۔ اس پر آج تک کسی نے انگلی نہیں اٹھائی تھی۔

یہ جیوی بھگتنی جب دھنو کی خیریت دریافت کرنے گئی' تو آہستہ سے دھنو کو کہنے لگی "جو گزری سو گزری دھنو! اب آخری وقت اعتراف کر لو' تو کچھ نہیں بگڑا۔ کہتے ہیں جس نے کہا تھا کہ رام کا نام نہیں لینا اس کے منہ سے بھی مرا مرا کہلوا کر لوگوں نے اس کو خدا سے بخشوا لیا....."

دھنو مرتے مرتے بھی ہنس پڑی کہنے لگی "بھگتنے کیوں میری فکر کرتی ہو! دھرم راج کو حساب دینا ہے دے لوں گی۔ یہ دھیلی جو پلو سے باندھی ہوئی ہے' دھرم راج کو کہوں گی لو بھنوا لو' اور حساب ختم کرو۔" اور جیوی بھگتنی کانوں میں انگلیاں دیتی واپس آ گئی تھی۔

اور پھر دوسری دوپہر دھنو مر گئی۔

دھنو کے چوتھے کے بعد گاؤں کے لوگوں نے اس کے صندوق کی تلاشی لی۔ اس میں سے اس کا وصیت نامہ مل گیا۔ دھنو نے اپنی زمین گاؤں کے اسکول کے نام لکھی ہوئی تھی' اور لکھا ہوا تھا "میری ایک ہی خواہش ہے کہ چار حروف لڑکیاں بھی پڑھ لیں' اور ان کی زندگی برباد نہ ہو۔"

پچیس، چھبیس اور ستائیس جنوری

مجھے اپنے کاروبار کے سلسلے میں سال میں ایک دو دفعہ بمبئی سے دہلی جانا پڑتا تھا۔ ہمیشہ اپنے دوست کے گھر ٹھہرتا تھا۔ دوست کا نام نہیں بتاؤں گا۔ صرف اتنا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ جانے سے پہلے ہمیشہ اس کو خط لکھ دیتا تھا۔ لیکن اس سال جنوری میں جب خط لکھا، تو اس نے جواب میں تار دیا کہ وہ پچیس، چھبیس اور ستائیس تاریخ کو وہاں نہیں ہو گا، اس لئے میں ان تاریخوں سے پہلے آؤں یا بعد میں۔ اور اس تار سے مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے میرے خط کے جواب میں خط لکھا تھا کہ وہ ان تاریخوں میں دہلی نہیں ہو گا۔۔۔۔۔۔ اور شائد اس وقت بھی یہی جنوری کا مہینہ تھا۔

میں نے پرانے خطوط کا فائیل دیکھا۔ اس کا خط ڈھونڈا۔۔۔۔۔ واقعی یہی جنوری کا مہینہ تھا، اور یہی تاریخ۔ بات کچھ عجیب سی لگی، لیکن اس دفعہ میں نے جانے کی تاریخوں کو تبدیل نہیں کیا۔ تبدیل کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ دو چار دن پہلے، یا دو چار دن بعد جا سکتا تھا، لیکن میں ان ہی تاریخوں میں دہلی چلا گیا۔ صرف اتنا کیا کہ اپنے دوست کے گھر نہیں گیا، ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ اس کے گھر ٹیلیفون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق وہ دہلی میں نہیں تھا۔ لیکن رہا نہ گیا، دل کیا اس کے ہسپتال فون کر کے اتنا ہی پوچھ لوں کہ اگر وہ اپنے گاؤں اپنے ماں باپ کے پاس گیا ہوا ہے، تو خیر خیریت سے ہی گیا ہوا ہے۔۔۔۔۔ یا کوئی خاص بات ہے؟ اس لئے فون کیا۔ خیال تھا۔۔۔۔۔ کوئی اور ڈاکٹر بولے گا۔ لیکن اس کی خیر خیریت پوچھنے والے حروف میرے منہ میں گھوم ہی رہے تھے، جب فون کے جواب میں مجھے اس کی اپنی آواز سنائی دی۔ پھر شائد میری اپنی آواز کی حیرانی تھی کہ مجھے اس کی آواز میں اس کا تپاک کچھ میٹھا سا محسوس ہوا۔ لیکن ساتھ ہی میں اپنی حیرانگی کی دلیل بھی دے رہا تھا، ہو سکتا ہے کسی وجہ سے اس کا جانا منسوخ ہو گیا ہو، اس نے جانا ہو،

لیکن جانہ سکا ہو۔۔۔۔۔۔ اور اب میرے آگے شرمندگی محسوس کر رہا ہو......

اور میں نے خود ہی اپنی دلیل کے زور پر کہا۔۔۔۔۔ "اب پھر ملاقات کس وقت ہوگی؟" دل میں اس کے جواب کا بھی اندازہ لگالیا' "تم ہوٹل سے سامان لے کر سیدھے گھر چلو! میں ابھی گھر پہنچتا ہوں۔۔۔۔۔" لیکن محسوس ہوا' مگر اپنے کان ہی مجھے دھوکہ دے گئے۔ اس کا جواب تھا۔۔۔۔۔ "چار بجے ہیں' میں آدھے گھنٹے تک یہاں سے فارغ ہو جاؤں گا' پھر سیدھا تمہارے ہوٹل آؤں گا۔"

خیر' ابھی بھی دلیل کچھ باقی تھی' سوچ رہا تھا' وہ میرے پاس آکر خود میرا سامان اٹھوائے گا' اور مجھے گھر لے چلے گا۔ لیکن تقریباً پانچ بجے جب وہ آیا' کتنی دیر تک میرے کام کے متعلق سرسری باتیں کرتا رہا' پھر ہم نے چائے پی' اور شام ڈھلنے پر آگئی' محسوس ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو' لیکن کہنے کے لمحے کو ٹال رہا ہو......

وہ میرا پرانا دوست تھا' حق دعوے کے ساتھ اس سے پوچھ بھی سکتا تھا' لیکن اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کا تذبذب نظر آرہا تھا' کہ میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ کچھ دیر بعد۔۔۔۔۔ اس نے جانا چاہا' کیا کہہ سکتا تھا' اس کو نیچے ہوٹل کے بیرونی دروازے تک چھوڑنے چلا گیا۔ دیکھا۔۔۔۔۔ وہاں اس کے پاؤں کچھ ٹھٹھک سے گئے' لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ مجھے واپس کمرے میں آئے تقریباً ایک گھنٹہ ہوا تھا' اس کا فون آیا۔۔۔۔۔ "سوری' آئی کانٹ ایکسپلین اینی تھنگ۔" میں نے جواب میں ہنسنا چاہا' "چلو معاف کیا۔ انجوائے یور سیلف۔۔۔۔" میری آنکھوں کے آگے ایک تصور سا آیا کہ ان دنوں میں اس کے پاس اس کے گھر ضرور کوئی لڑکی ہے' لیکن یہ اندازہ بھی مجھے منتا محسوس ہوا' کیونکہ اس کی آواز میں ایک اداسی تھی۔

اس سال ستمبر میں مجھے دوبارہ دہلی جانا پڑا' لیکن میں نے اس کو خط نہیں لکھا۔ دہلی آکر کسی ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ ہوٹل سے فون کیا' اس کی آواز پرانے تپاک سے بھرپور تھی۔ وہ اسی وقت ہسپتال سے چھٹی لے کر میرے ہوٹل میں آیا اور زبردستی میرا سامان اٹھوا کر مجھے اپنے گھر لے گیا۔ معلوم نہیں ایک دوست کے ناطے مجھے یوں کرنا چاہئے تھا کہ نہیں' لیکن ایک دن میں نے اس کے نوکر سے تنہائی میں جنوری والی بات۔۔۔۔۔ باتوں باتوں میں

پوچھی۔ پرانا نوکر تھا' میری بھی مالک کی طرح عزت کرتا تھا' اس لئے عزت سے بولا۔۔۔۔
"مجھے تو صاحب ہر برس چھبیس جنوری کا میلہ دیکھنے کے لئے تین دن کی چھٹی دے دیتا ہے۔"

تو۔۔۔۔ وہی تین دن' پچیس چھبیس اور ستائیس جنوری۔ اس سے میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ اس کی چھٹی میں صرف دن شامل نہیں ہوتے تھے راتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ وہ تینوں راتیں باہر نوکروں کے اس ڈیرے میں رہتا تھا' جہاں اس کے دوسرے گاؤں والے رہتے تھے۔ نوکر کو ہر سال ان دنوں کی چھٹی مجھے عام معلوم نہ ہوئی۔ محسوس ہوا۔۔۔۔ کوئی بھید ہے' جو میرا دوست بھید ہی رکھنا چاہتا ہے۔

اور پھر جب چار مہینوں کے بعد جنوری کا مہینہ آیا' تو میں چاہے دہلی کے سفر کو ابھی اور آگے ڈال سکتا تھا' میں نے اپنے دوست کو خط لکھا' کہ مجھے پچیس تاریخ کو دہلی آنا پڑے گا۔ جواب میں اس کا خط آیا۔۔۔۔ "کیا اس تاریخ سے تمہارے کاموں کو کوئی ضد ہو گئی ہے؟ تم دو چار دن پہلے یا بعد میں کیوں نہیں آسکتے؟"

تو۔۔۔۔ ضرور کوئی بات تھی' جو نہ وہ بتا سکتا تھا' نہ میں پوچھ سکتا تھا۔ میں اس مہینے دہلی نہیں گیا۔ بعد میں مارچ میں گیا' اور اس کے پاس ٹھہرا۔ اور اس دفعہ میں نے دہلی میں پانچ ایکڑ کا ایک فارم خریدا' جہاں سال میں کم از کم ایک مہینہ ٹھہرنے کا میرا خواب مجھے ہمیشہ کھینچا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ میرے دوست کی محنت سے سرانجام ہوا۔ فارم کے کاغذات کی اس نے جانچ پڑتال کی۔ دو مالیوں کا بندوبست کر کے دیا اور فارم میں ایک چھوٹی سی رہائش کا نقشہ بھی اس نے بنوا کر دیا تھا۔ میں وہاں عمارت شروع کروا کر واپس بمبئی چلا آیا تھا' بعد میں اس نے اس کی نگرانی کی تھی' اور اس کو مکمل کروا کر مجھے اس کی چابی بھجوا دی تھی۔

پھر۔۔۔۔ اچانک اس کا خط آیا کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ خط بڑا خوش تھا۔ اس لئے میں خوش تھا' مگر شکائیت کے انداز میں میں نے اس کو لکھا کہ اس نے مجھے اپنی شادی میں شمولیت کے لئے کیوں نہیں بلایا' اس کا جواب آیا۔۔۔۔ "جس وقت شادی کا فیصلہ ہوا' اسی وقت شادی کر لینا چاہتا تھا' ورنہ شائد کبھی نہ ہو سکتی۔ اس لئے تمہیں بلانے کا وقت ہی نہیں تھا۔" خط میں یہ نہیں لکھا ہوا تھا' کہ یہ شادی اس وقت کے ٹلنے کے بعد کیوں نہیں

ہو سکتی تھی؟ لیکن یہ ضرور لکھا ہوا تھا "میں بہت خوش ہوں' میں تمہاری بھابھی کو عشق کی حد تک محبت کرتا ہوں۔۔۔۔۔" اس لئے مجھے اس کی شادی میں شامل نہ ہونے کا جو ملال تھا۔۔۔۔۔ وہ ملال جیسا نہ رہا۔ ایک انتظار سا ضرور لگ گیا کہ اب میں دہلی کب جا سکوں گا؟ اس انتظار میں ایک اور وجہ بھی شامل تھی۔۔۔۔۔ میں نے ابھی اپنے فارم والے گھر میں رہ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہاں دو مالیوں کے علاوہ میں نے ایک ایسے آدمی کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔۔۔۔ جو ہر ہفتے فارم پر جا کر فارم کی ضروریات کو دیکھتا تھا' اور مجھے حساب کتاب لکھ بھیجتا تھا۔ اور میری آنکھوں میں اپنے فارم کی ہریالی ہر ہفتے بالشت بھر اونچی ہوتی رہتی تھی......

اچانک میرے دوست کا فون آیا کہ اگر میں فارم والے گھر کی چابی اس کو بھیج دوں' تو وہ تین دن وہاں جا کر رہنا چاہتا ہے۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا۔ مجھے وہ پچیس' چھبیس اور ستائیس جنوری کے تین دن اس بات سے منسلک معلوم ہوئے۔ کہا۔۔۔۔ "میں کل چابی بھیج دوں گا۔ ویسے میں بھی دہلی آنا چاہتا ہوں' لیکن اگر تم وہاں اکیلے رہنا چاہو' تو میں اس ماہ نہیں' آئندہ ماہ آجاؤں گا۔" جواب میں اس نے کہا' "میں نے پچیس' چھبیس اور ستائیس جنوری صرف تین دن وہاں رہنا ہے' تم بھی آجاؤ! اکٹھے رہیں گے۔"

عجیب بات۔۔۔۔ وہی تاریخیں تھیں' لیکن اس دفعہ اس کو اعتراض نہیں تھا کہ ان تاریخوں میں نہ آؤں۔ ایک گھبراہٹ بھی ہوئی۔۔۔۔ کیا خوش شادی کے بعد بھی اس کو ان تاریخوں کی تنہائی چاہئے؟ کیوں؟۔۔۔۔۔ پوچھا گیا۔۔۔۔۔۔ "بھابھی کا کیا حال ہے؟" جواب میں کہیں بھی تذبذب جیسا کچھ نہیں تھا' وہ کہہ رہا تھا' "بہت اچھی لڑکی ہے' تم اس کو مل کر بہت خوش ہو گے۔ ہم اٹھائیس تاریخ کو اکٹھے گھر چلیں گے۔"

کچھ گرفت میں نہیں آرہا تھا' لیکن اس کی شادی ٹھیک ہے' یہ کافی تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ میں پچیس تاریخ کو صبح پہنچ جاؤں گا' سیدھا فارم پر جاؤں گا' اور اس کا انتظار کروں گا۔ اس کی بیوی کے لئے بمبئی سے میں نے ایک خوبصورت سی ساڑھی خریدی اور پچیس تاریخ کو صبح دہلی پہنچ گیا۔ فارم کی ہریالی میرے اندازے جیسی تھی' میرے دل کی زمین میں سے بھی جیسے پھول پتے اگ رہے تھے' عارضی کارندہ وہاں پہنچا ہوا تھا' اس نے میرے کہنے کے

مطابق، جن چیزوں کی مجھے ضرورت تھی، لے آیا تھا۔ مالیوں نے میری کاٹیج کو صاف کر کے سنوار دیا تھا اور کچھ پھولوں سے سجا رکھا تھا۔

شام گہری ہونے لگی تھی، جس وقت میرا دوست آیا۔ اس دفعہ میں اس کے لئے بمبئی کے ایک دوست سے فرنچ کونیک لایا ہوا تھا۔ بہت عرصہ گزرا، جب اس نے ایک دفعہ مجھے کونیک والی چائے پلا کر کہا تھا۔۔۔۔ اس کا بس چلے، تو وہ ہمیشہ کونیک والی چائے پئے۔ اس دفعہ یہ تین دن میں اس کو کونیک والی چائے پلانا چاہتا تھا۔ ڈبہ بند پھل اور سبزیاں چاہے میں بمبئی سے لایا تھا، لیکن اپنے فارم کی گوبھی اپنے ہاتھوں پکائی۔ میرے لئے بمبئی کی زندگی سے ٹوٹنے کا یہ بڑا پیارا دن تھا۔

اس رات پہلے کونیک والی چائے اور پھر نیٹ کونیک والی چائے اور پھر نیٹ کونیک پیتے میرا دوست کہنے لگا۔۔۔۔ "تم کئی برسوں سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے نا؟ میں بھی کئی برسوں سے تم کو کچھ بتانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔" یہ شائد مٹی میں سے کوئی سبز رنگ نکلنے کا وقت تھا، میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہنس پڑا۔۔۔۔ "یہ پچیس، چھبیس اور ستائیس جنوری۔۔۔۔ تین دن میری سمجھ سے باہر ہیں۔ تم کو کس طرح بتاؤں۔۔۔۔۔ اچھا شروع سے بتاتا ہوں۔۔۔۔ پورے پانچ برس ہوئے، میرا ایک دوست آج کے دن، پچیس تاریخ کو میرے گھر آیا تھا۔ کمبخت جوان بھی تھا، خوبصورت بھی اور بہت پیارا شاعر بھی۔ دہلی میں ہندوستان کی تمام زبانوں کا پچیس جنوری کو ایک مشاعرہ ہوتا ہے، اس کو اس مشاعرے میں سرکاری بلاوا تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ ایک بڑی خوبصورت لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ اپنے شہر وہ اس لڑکی سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ اسی لئے یہاں لایا تھا۔ وہاں سے شائد اس کے ساتھ نہیں آیا تھا، لیکن یہاں اسٹیشن سے اس کو ساتھ لے کر آیا۔ وہ دونوں تین دن میرے گھر رہے۔ پچیس کی رات مشاعرہ تھا چھبیس کو تمام شاعروں کے لئے سرکاری دعوت تھی، لیکن ستائیس کی ایک رات انہوں نے زندگی سے اور کچھ چرا لیا۔ اور پھر الگ الگ گاڑی میں واپس چلے گئے۔۔۔۔۔"

یہ بات سنتے، میں جیسے اس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا، جس کے پاس میں برسوں کی تلاش کے بعد جیسے پہنچ تو گیا ہوں، مگر ابھی یہ سوچ بھی نہ سکتا کہ اس دروازے کے اندر کیا

ہے..... کوئی کہانی شائد پانچ برس چلتی رہی تھی' اور میرا دوست بھی اس کے ساتھ پانچ برس چلتا رہا تھا۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک لمبا سفر طے کر کے آنے کا احساس سا تھا۔ کچھ سانس لے کر کہنے لگا۔۔۔ "لیکن دہلی کے تین دنوں والی بات نہ اس کے گھر میں پوشیدہ رہی' نہ اس لڑکی کے گھر۔ اس کی بیوی بڑی دکھی تھی' اور اس لڑکی کے ماں باپ بڑے دکھی۔ شہر ایک ہی تھا' ویسے بھی چھوٹا' دونوں گھروں کی دشمنی سارے شہر میں پھیل گئی۔ ایک کی جان کو تشدد تھا' دوسرے کی جان کو خطرہ۔ لیکن چھ ماہ گزرے تھے' کہ ساری بات ہی الٹ گئی۔ کمبخت سارا دن اور ساری رات شراب پیتا تھا' چھ مہینوں میں ختم ہو گیا....."

"کیا مطلب؟" میں کانپ سا گیا۔

"قبل از وقت موت....." میرے دوست کی آواز اس کے حلق میں ڈوب سی گئی۔ کونیک کے تیکھے پانچ چھ گھونٹ بھر کر اس نے کہا' "پھر جب آئندہ جنوری کی پچیس تاریخ آئی' مجھے اس لڑکی کا روتا خط آیا کہ "میں تین دن اس کمرے میں کسی کو نہ جانے دوں' جس کمرے میں گزشتہ برس وہ دونوں رہے تھے۔ اس نے خط میں گیندے کے دو پھول بھیجے کہ وہ پھول میں اس کمرے میں اسی پلنگ پر رکھ دوں۔۔۔ جو ان کے سہاگ کی سیج تھا۔ اور اس نے لکھا کہ دونوں کی روح تین دن اس کمرے میں رہے گی۔"

میں یہ بات سنتے' جیسے میں نہیں تھا' صرف ایک اچنبھا تھا۔ دوست سے پوچھنا چاہتا تھا۔۔۔ کہ تم نے اس بات پر یقین کر لیا؟ لیکن میرے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے وہ کہنے لگا۔۔۔"

مجھے اس کا خط صرف اس کا پاگل پن معلوم ہوا' اس کی دیوانگی' مگر دیوانگی' کا بھی شائد کوئی جادو ہوتا ہے' میں نے خط کو ایک طرف رکھ دیا' لیکن وہ پھول مجھ سے پھینکے نہیں گئے۔ یہ بھی یاد آیا کہ اس کمبخت نے اس لڑکی کو گیندے کا پھول کہہ کر یہاں ہی ایک نظم لکھی تھی۔ اس لئے میں نے دونوں پھول اس کمرے کے پلنگ پر رکھ دئے اور کمرہ بند کر دیا' مگر اس رات ایک عجیب واقعہ رونما ہوا....."

میں سارے کا سارا جیسے اپنی آنکھوں میں سما گیا۔۔۔ اور دوست کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا' وہ کہنے لگا۔۔۔ "تقریبا آدھی رات تھی' مجھے کمرے میں کسی کے قدموں کی

آواز آئی' اور پھر قدموں کی آواز کمرے سے نکل کر' باہر باورچی خانے کے اسی تھڑے تک آتی محسوس ہوئی' جہاں پانی کا گھڑا پڑا ہوا تھا پھر گھڑے میں سے پانی انڈیلنے کی آواز بھی آئی اور کسی کی کلائی میں کانچ کی چوڑیوں کے چھنکنے کی بھی......"

"ناممکن۔" میرے منہ سے نکلا' لیکن میری آواز جیسے کانپ سی گئی میرا دوست کہنے لگا' "میں نے بھی صبح اٹھ کر یہی سوچا کہ سب میری اپنی یادوں کا وہم تھا...... گزشتہ برس اس لڑکی نے دونوں کلائیوں میں سبز کانچ کی چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں---- اور یہ سب کچھ اسی یادداشت میں سے مجھے سنائی دیا تھا۔ لیکن اگلی رات بھی اسی طرح ہوا اور اس سے اگلی رات بھی......"

"پھر اگلے برس؟"

"اگلے برس کی پچیس تاریخ کو اس لڑکی کا خط آیا' وہی التجا اور وہی گیندے کے دو پھول...... اور پھر اس طرح تینوں راتیں وہی آواز....."

اب میں کچھ کہنے کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ کمرے میں میں نے لکڑیوں کی آگ جلا رکھی تھی---- صرف وہی جل رہی تھی' میں جیسے بجھ گیا تھا۔

دوست کے منہ کی طرف دیکھا---- آگ کی پرچھائیں میں اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جلتی لکڑیوں پر ایک لکڑی کو رکھتے میرا دوست کہنے لگا------ "پورے تین برس یوں ہوتا رہا۔ ان کے حقیقی ملاپ کو آنکھوں سے دیکھنے والا جیسے میں اکیلا تھا' ان کی روحوں کے ملاپ کو دیکھنے والا بھی دنیا میں صرف میں ہی تھا۔ اس لئے اس عجیب حقیقت کو صرف اپنے تک ہی رکھنا چاہتا تھا---- تم کو اس لئے لکھتا تھا کہ تم ان دنوں میں نہ آنا......"

"مگر آج پھر پچیس تاریخ ہے----" اتنا ہی کہا' ظاہر تھا کہ کہنا چاہتا تھا---- آج تم وہاں کیوں نہیں رہے؟ آج وہاں گیندے کے پھول کون رکھے گا؟ کہ وہ آگ کی لاٹ کی طرح ہنسنے لگا۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا' پھر ہنستا ہوا کہنے لگا' "گزشتہ برس جولائی کی بات ہے' ہمارے ہسپتال میں ہمارے سائیکی آٹیرسٹ کے پاس ایک کیس آیا۔ اس نے وہ کیس میرے ساتھ ڈسکس کیا کہ فلاں شہر سے ایک لڑکی کا عجیب کیس اس کے پاس آیا ہے' جو سال میں تین دن ہوش وحواس کھو دیتی ہے اور ہمیشہ ہر سال۔ مجھے محسوس ہوا یہ ضرور اسی لڑکی کا

کیس تھا۔ میں نے اس سے تاریخیں پوچھیں' تو وہ تاریخیں تھی۔۔۔۔۔۔۔جنوری کی پچیس' چھبیس اور ستائیس تاریخ۔ اس لڑکی کے ماں باپ سب ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر یہاں دہلی کے ہسپتال میں آئے تھے......"

"تم اس کو ملے نہیں؟" بجھتی لکڑی کے دھوئیں کی طرح مجھ میں ایک حسرت سی آئی۔۔۔۔۔ کاش! میں ایک دفعہ اس لڑکی کو دیکھ سکوں...... کیا واقعی کوئی اس طرح کی لڑکی ہوتی ہے......

میرے دوست نے ہاں میں سرہلایا' پھر ہنس سا پڑا۔۔۔۔۔ "ملتا تو تھا ہی' ملا۔ وہی تھی۔ وہی ہو سکتی تھی۔ مجھے دیکھ کر رو پڑی۔ اس کو زبردستی ہسپتال میں لائے تھے۔ زبردستی تندرست کرنا چاہتے تھے' زبردستی اس کی شادی کرنا چاہتے تھے......"

"پھر؟"

"میں نے اپنے ڈاکٹر ساتھی سے اس کے ساتھ باتیں کرنے کی اجازت لے لی۔ اس کو روزانہ ملتا تھا۔۔۔۔۔ ایک دن میں نے اس سے کہا' "تم جو کہتی ہو' ٹھیک ہے' پورے تین دن اس کی روح تمہارے پاس ہوتی ہے' تمہاری اس کے پاس۔ لیکن سال کے باقی تین سو باسٹھ دن؟ تم ان تین سو باسٹھ دنوں کے لئے شادی کر لو! بڑے دل والی لڑکی تو وہ تھی ہی' کہنے لگی' "اچھا میرے ماں باپ کو سمجھا دیں کہ جو شخص میرے ساتھ سال کے تین سو باسٹھ دنوں کے لئے شادی کرنا چاہے' میں کر لوں گی۔" اور اس دن' اس وقت مجھے واقعی اس کے ساتھ پیار ہو گیا......"

میرا کانپتا سا ہاتھ میرے دوست کے ہاتھ کو چھوا' "اور اب وہی...... تمہاری بیوی......؟"

بجھتی لکڑیوں پر رکھی نئی لکڑی کی لاٹ کی طرح میرا دوست ہنسنے لگا۔۔۔۔۔ "وہی میری بیوی ہے۔۔۔۔۔ صرف جنوری کی پچیس' چھبیس اور ستائیس تاریخ کو چھوڑ کر......"

دوست کے آگے بھی سر جھک گیا' مگر محسوس ہوا' اس وقت' میں اس کمرے کی دہلیز کو ایک سلام کر رہا ہوں' جس کے اندر ایک خالی پلنگ پر ایک جوان لڑکی گیندے کے پھول رکھ رہی ہے......

جوگا سنگھ کا چوبارہ

پٹیالے کے چوک انار دانہ سے پھول سینما کو جائیں ---- تو راستے میں ایک تنگ سی اناج منڈی آتی ہے۔ پھر نالہ پار کر کے لکڑی کی دکانیں ہیں ------ شہتیروں اور چوکھاٹوں کی۔ گڈوں کے پہیئے وہاں بنتے ہیں ---- لوہاری اور ترکھانی ٹھک ٹھک ایک ہی سانس کانوں میں پڑتی ہے۔ وہاں ایک ٹوٹا سا گیٹ ہے ---- کنور نونہال سنگھ کے اوپر گری ڈیوڑھی کی طرح' اور محسوس ہوتا ہے شائد یہ گیٹ بھی وہاں سے گزرتے ہوئے کسی کے سر پر آ گرے گا۔ لیکن اس خوف سے گزر جائے ---- تو اس کے اندر ایک بڑا سا ڈیرہ نظر آتا ہے ---- جس کے ایک طرف سادھو رہتے ہیں' اور ایک طرف تقریباً تین سو بھینسیں اور ان کے رکھوالے۔ اس نانک شاہی اینٹوں کے چوگردے میں ایک املی کا درخت بھی ہے ---- چار برس پرانا۔ اس لئے اس ڈیرے کو املی والا ڈیرہ کہتے ہیں۔

اوپر ---- کبھی بہت سے چوبارے ہوتے ہوں گے' لیکن اب ایک کے علاوہ' باقی سب گر گئے ہوئے ہیں۔ ایک چوبارہ کھڑا ہے جیسے ایک ضد باندھ کر کھڑا ہو۔ اور اس چوبارے میں جوگا سنگھ رہتا ہے۔

املی کا درخت چار سو برس پرانا ہے' اور جوگا سنگھ مار کسی وقت کا۔

نصف چوبارے میں ہر دواری صفیں بچھی ہوئی ہیں' وہاں اکالیوں کے وقت کی دری بچھی ہوئی ہے' اور پڑدادیوں کے وقت کے چار کھیس اور چار لحاف پڑے ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک "شہنشاہی" بسترے پر جوگا سنگھ سوتا ہے' اور باقی تینوں پر اس کے پاس آنے جانے والے۔

چوبارے میں دو الماریاں بھی ہیں ---- کتابوں سے بھری ہوئیں۔ جن میں سے ایک الماری کے شیشے پر تاش کا ایک جوکر گوند سے چپکا ہوا ہے' اور دوسرے شیشے پر ایک بلغارین

رقاصہ کی تصویر لٹی سے لگی ہوئی ہے۔

چوبارے میں ایک دیوار پر گورکی کی تصویر ہے' اور ایک دیوار پر (جوگا سنگھ کے سامنے والی دیوار پر) حسین کی پینٹنگ ہے۔۔۔۔۔۔ میسنگ ایرد۔

دیواروں پر کئی جگہ کھونٹیاں ٹھونکی گئی ہیں۔۔۔۔۔۔ جن میں سے کسی پر لائینوں والا نائیٹ سوٹ ٹنگا ہوا ہے' اور کسی پر مائع سے اکڑی گہرے رنگ کی پگڑی۔

چوبارے کے درمیاں میں ایک میز ہے' جس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہ یہ چوبارے کو دو حصوں میں تقسیم کردیتا ہ' ے اور بستروں والے حصے کو ایک طرف کرکے' دوسرے حصے کو جوگا سنگھ کا لنگر بنا دیتا ہے' جہاں لکڑی کے پھٹے پر مٹی کے تیل کا سٹوو پڑا ہوا ہے' اور لکڑی کے پھٹے کے نیچے۔۔۔۔۔ گھی اور آٹے کے ڈبے' اور نمک مرچوں کی ڈبیاں پڑی ہوئی ہیں۔

چوبارے کی بیرونی دیوار پر کتنی ہی محرابیں ہیں۔۔۔۔ جن کی ہر گہرائی میں تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں۔ لیکن ہر تصویر کا چہرہ دیوار کی طرف ہے' اور چوکھٹے کے گتے والا اور کیلوں والی طرف باہر کی طرف۔ جوگا سنگھ کے پاس آتا جاتا کبھی کسی تصویر کو کیل سے اتار کر اگر دیکھ لے' تو تصویر کو سیدھی لٹکا دے' تو جوگا سنگھ کے چوبارے کی نانک شاہی اینٹیں تیوریاں ڈال کر اس کی طرف دیکھتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن خود جوگا سنگھ تھوڑا سا مسکرا دیتا ہے' اور اپنے ہاتھ سے اس تصویر کو دوبارہ الٹا کر دیتا ہے۔

اگر کوئی آنے جانے والا حیران ہو کر جوگا سنگھ سے پوچھ ہی بیٹھے' بھئی' تصویریں لگانے کا یہ کیا شوق ہوا' تو جوگا سنگھ کبھی کبھی کہہ دیتا ہے'' یہ بھی آئے گئے۔'' اور پوچھنے والے کو محسوس ہوتا ہے' جیسے اس کا چہرہ بھی ان تصویروں کے چہروں کی طرح دیوار والے حصے کی طرف ہو گیا ہو......

چار برس کے املی کے درخت کی طرح جوگا سنگھ مارکسی وقت کا ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہ املی کے نرم پتوں کی طرح وہ جوان بھی نظر آتا ہے' اور گورے سفید رنگ کا بھی۔ کبھی بے فکروں کی طرح جو کپڑے ہاتھ آئے پہن لئے' لیکن کبھی گہرے رنگ کی مائع والی پگڑی باندھ کر اس کے ساتھ اسی رنگ کی قمیض پہن کر بڑا سنورا سجیلا بھی ہو جاتا ہے۔

ایک رات ------ اس کی ہر دواری صفوں پر اکالیوں کے وقت کی دری پر ------ اس کے جیل کے وقت کے تین مارکسی دوستوں نے قبضہ کر رکھا تھا' کہ رات کو دیسی شراب کے پیالے پیتے اور تلے ہوئے آلو کھاتے رات تین چوتھائی کے قریب گزر گئی۔ اور پھر پڑدادے کے وقتوں کے لحافوں میں ان کو نیند نہیں آ رہی تھی --- کہ ان میں سے ایک نے محرابوں میں لگی تصویروں کا ذکر چھیڑ دیا --- "بھئی جوگیا! آج تو بھید والی بات بالکل سچ سچ بتا دو! کہ یہ تصویریں تم نے کیوں لگائی ہوئی ہیں۔ اگر تم کو ان کے ساتھ اتنا ہی پیار ہے' تو سیدھی کر کے لگاؤ! نہیں تو ان کو شیشوں سے نکال کر پھاڑ کر پھینک دو!"

"بس' یہی تو بات ہے ------ دیوار پر لگائی بھی ضرور ہیں' اور ان کو اب دیکھنا بھی نہیں ----" جوگا سنگھ نانک شاہی اینٹوں کی طرح چھوٹا چھوٹا ہنسا..... اور پھر رات والی دیسی شراب کی طرح مالٹے کے رنگ جیسا ہو کر کہنے گا" جب لگائی تھیں' پیار سے ہی لگائی تھیں۔ اس وقت میں نویں یا دسویں میں پڑھا کرتا تھا۔ پھر میں بڑا ہو گیا' اور سال سال کے وقفے پر محسوس ہوا ----- مجھے پہلی تصویر سے پیار نہیں رہا تھا' پھر دوسری کے ساتھ نہیں رہا تھا' پھر تیسری کے ساتھ..... اور باری باری ہر ایک کو سیدھی سے الٹی کرتا رہا..... یہ نو تصویریں میرے نو سالوں کا حساب ہیں......"

"پہلی تو بھائی ویر سنگھ کی ہے' میں نے سیدھی کر کے دیکھی تھی۔" جوگا سنگھ کے دوستوں میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں ---- یہ تصویر میں نے ۱۹۵۷ء میں لگائی تھی' جب میں نے بھائی ویر سنگھ کے مرنے کی خبر سنی تھی۔ میں اس وقت نیا نیا لکھنے لگا تھا' اس کی موت کی خبر سن کر میں نے اس کی تصویر بھی لگائی اور نظم بھی لکھی ---- آج ایک دیا بجھ گیا۔ یہ نظم میں نے مشاعروں میں پڑھی بھی تھی۔ لیکن کچھ برسوں کے بعد میں جب کشمیر گیا' بھائی ویر سنگھ کی نظم "ملک ہلارے" مجھے زبانی یاد تھی لیکن کشمیر کی خوبصورتی دیکھ کر مجھے "ملک ہلارے" نظم بھول گئی ---- محسوس ہوا' اس نے قدرت کو ٹین کے ڈبے میں بند کیا تھا۔ اور میں نے گھر آ کر اپنی دیوار پر اس کی وہ تصویر الٹی کر دی...... ان دنوں میں میں نے پورن سنگھ کو بھی پڑھا تھا ---- وہ جس طرح کیکروں سے بغلگیر ہوتا تھا --- گھاس کے تنکوں کو چوم چوم کر

وہ ۱۹۴۷ء کے دنوں پر ایک ناول لکھ رہا ہے' "ستلج تمہاری قسم"۔۔۔۔۔ مجھے اس کی باتوں نے بہت متاثر کیا۔ اور پھر اس کی کہانی "لک ٹنوں ٹنوں" پڑھی' تو کچھ سمجھ نہ آئی۔ معلوم ہوتا تھا سارا پیوندی پروگرام ہے۔ کئی سطریں تو بہت اچھی ہیں' لیکن تمام مل کر کچھ بھی نہیں بنتا۔ ایک دفعہ اس نے کہیں تقریر کی' اور کہا "میں چھوٹا سا تھا' جب میرا باپ مرگیا تھا' اور اس کا سر میری رانوں پر پڑا تھا۔ مجھے اب بھی محسوس ہوتا ہے کہ میرا باپ مرا نہیں اور اس کا سر میری رانوں پر پڑا ہے۔ یہ روائت ہے اور انسانی رشتے بارے اس نے کہا تھا' اور مجھے اس دن وہ پھر بڑا اچھا لگا۔ لیکن پھر جب اس کا ناول "سوئی بازار" پڑھا تو محسوس ہوا۔۔۔۔۔ اب اس کا باپ مرگیا ہے۔ اور اس کی رانوں پر پڑی ہوئی باپ کی لاش سوکھ رہی ہے۔ تو میں نے اس دن اس کی تصویر دیوار پر الٹی کردی۔"

جوگا سنگھ کی لائنوں والی قمیض کے سبز' زرد اور نیلے رنگ' چوبارے کے واحد بجلی کے بلب میں بھی جیسے اور گہرے ہو کر نظر آرہے تھے۔ اب وہ سبز' زرد رنگ کے خمار میں تھا' کہنے لگا۔۔۔۔۔ "پھر میں نے سنتوکھ سنگھ دھیر کی تصویر دیوار پر لگائی۔ اس وقت اس نے "صبح ہونے تک' مشترکہ دیوار اور ایک سوار" جیسی کہانیاں لکھی تھیں۔ طاقتور مارکسی ازم کی کہانیاں۔ مجھے محسوس ہوا۔۔۔۔۔ بھئی یہ آدمی انقلابی باتیں کرتا ہے۔ لیکن پھر اس نے کہانیاں لکھنی بند کردیں' اور گنڈاسوں اور تلواروں کے ساتھ شاعری کرنے لگا۔ شاعری بھلا کبھی ایسے ہوتی ہے؟۔۔۔۔ میں نے اس کی نظمیں پڑھیں' اور اس کی تصویر دیوار پر الٹی کر دی۔"

"یہ تو بات ہوئی ناجوگیا' ہم تمہیں یونہی تو اپنا گورو نہیں مانتے' ہر بات پر تمہارا مشورہ لینے کے لئے آتے ہیں....." جوگا سنگھ کے دوستوں میں سے ایک جیسے اسی وقت اس کا چیلا ہونے کو تیار تھا۔

جوگا سنگھ کی داڑھی کا سیاہ رنگ اس کے گورے چہرے پر سجنے لگا' اور اس کے ناک کی دھار اور تیکھی معلوم ہونے لگی۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔۔۔۔۔ "پھر ہربجن سنگھ اچھا شاعر معلوم ہوتا تھا' اس نے جب لکھا۔۔۔۔۔ "چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ کہ لگے نہ میری لاش کنارے" میں نے اس کی تصویر دیوار پر لگا دی۔ پھر اس نے تنقید نگاری لکھنی شروع کی' تو

خوش ہوتا تھا۔۔۔۔ شاعر تو وہ تھا‘ بھائی ویر سنگھ نہیں تھا......"

جوگا سنگھ کے تینوں دوست لحافوں سے اٹھ کر بیٹھ گئے‘ اور پوچھنے لگے‘ "پھر اس کی تصویر؟"

چوگا سنگھ اپنے لائینوں والے کرتے کی لائینوں کی طرح گن کر بتانے لگا" دوسری تصویر میں نے گور بخش سنگھ کی شیشے میں جڑی تھی۔ اس وقت میں نے اس کی ایک کہانی میں سے ایک سطر منہ زبانی یاد کی ہوئی تھی‘ "میں نے اس کے جوٹھے گلاس میں سے صاف پانی گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیا۔" میں سوچتا تھا۔۔۔۔ جب میں کسی لڑکی کو محبت کا خط لکھوں گا‘ اس میں یہ سطر بھی لکھوں گا۔ لیکن جب میں بڑا ہوا۔۔۔۔ مجھے اس بات کی سمجھ کچھ اور طرح ہی آئی۔۔۔۔۔ کہ گور بخش سنگھ نے جوٹھے کو جوٹھا کر کے قبول نہیں کیا تھا۔۔۔۔ پہلے جوٹھے لفظ کو پاک کیا تھا۔۔۔۔ اس کو صاف کیا تھا‘ اور پھر اس کو منہ لگایا تھا۔ اس کی بھلا جوٹھے پانی کو پینے کی ہمت کیوں نہ ہوئی؟۔۔۔۔ یہ تو سراسر کڑ مریدوں والی بات تھی۔ اور میں نے اس کی تصویر الٹی لٹکا دی۔ تیسری تصویر میں نے سنت سنگھ سیکھوں کی الٹی کی تھی۔ جب سیدھی لگائی تھی تو محسوس ہوا تھا کہ وہ مارکس ازم بریکٹ ہے‘ مگر جس دن اس نے بی بی پربھ جوت کور کو گریٹ پوئٹ کہا‘ مجھے محسوس ہوا‘ جٹ اول جلول کہنے لگا ہے۔ میں نے اسی دن اس کی تصویر الٹی کر دی تھی۔۔۔۔ اور چوتھی۔۔۔۔"

"وہاں ایک تصویر جسونت سنگھ کنول کی لگی ہوئی ہے"۔۔۔۔ اس کے دوستوں میں سے ایک نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں‘ چوتھی بار میں نے اسی کی تصویر الٹی لٹکائی تھی۔ پہلے محسوس ہوا کرتا تھا۔۔۔۔ اچھی دیہاتی زبان لکھتا ہے‘ اور ناولوں میں کامریڈ کردار بھی شامل کرتا ہے۔ اس کو مل کو بھی دیکھا‘ اس کا اٹھنا بیٹھنا اپنے گاؤں کے لوگوں کی طرح کا تھا‘ اس لئے اچھا لگتا تھا۔ لیکن جب میں چار حروف پڑھ گیا‘ تو محسوس ہونے لگا کہ اس کے ناول تو دسویں فیل لڑکوں کو تو اچھے لگ سکتے ہیں...... اور میں نے اس کی تصویر کا چہرہ دیوار کی طرف کر دیا۔ اور اسی طرح دیوندر ستیارتھی کی تصویر کا چہرہ بھی ایک دن دوسری طرف لگا دیا۔ میں نے جب اس کی کہانی "سانپ اور آدمی" پڑھی تھی‘ اس کی تصویر خرید کر لایا تھا۔ بعد میں جب اس کو ملا‘ تو اس نے مجھے بتایا کہ

آئے، ویسے گئے، اب اصول پرست اپنی دیوار پر لگاؤ۔

جو گا سنگھ کے دلکی چال پر چلتے گھوڑے کو جیسے سامنے ایک دیوار نظر آگئی ہو، گھوڑے کی باگیں کھینچ کر کہنے لگا۔۔۔۔۔۔ "نہیں یار، اب کسی کی تصویر نہیں لگانی۔۔۔۔۔ پھر چار دن کے بعد اس کو بھی الٹا کرتا پھروں گا۔۔۔۔۔ میں اپنی دیوار پر پہلے ہی کتنے کیل ٹھونک چکا ہوں......"

بھابھی مورنی

"اری جندے! اب یہ پونیاں کس طرح کاتنی ہیں؟" اس نے اپنے روئی جیسے سفید بالوں کو ریٹھوں سے دھویا' اور پونیوں جیسی بالشت جھربالوں کو نچوڑتی دلائل میں گم ہو گئی۔

وہ جیسے دلائل کے تار اٹیرن پر اٹیر رہی تھی "رزق کا کھا کون ٹالے..... چڑیوں کے بچے اڑنے کے قابل ہوئے' تو نہ جانے کون سے درختوں پر جا بیٹھیں..... باری باری تینوں شہر کو چلے گئے......"

اس نے واقعی تینوں بیٹوں کے لئے چھاتی میں گھونسلہ بنایا تھا۔ ان کے سو کام ہوتے تھے' چارپائی پر کمر سیدھی کرنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی' لیکن پھر بھی وہ کبھی تھکتی نہیں تھی۔ اور اب بڑا شادی شدہ نوکری پر' اور چھوٹے دونوں شہر میں پڑھنے کے لئے چلے گئے تھے' اور فارغ جندو کو محسوس ہوتا تھا--- اس کے بند بند میں اکڑاؤ آ گیا ہے۔

"کالی روئی تو ختم ہو گئی' اب یہ سفید کس طرح کاتوں گی؟" اس کو جو سوچیں جوانی کے وقت نہیں آئی تھیں--- اب بڑھاپے میں گھٹنوں کے درد کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی تھیں..... اور اس کو گھنے سیاہ بالوں کی یاد آئی۔ جو واقعی موروں کے رقص کی طرح اس کی پیٹھ پر ناچتے تھے......

"وے ساؤ! تم نے کس وقت میرا نام مورنی رکھا تھا..... مورنیوں کے نصیب میں رقص کہاں..... مورنیاں تو پاؤں کو دیکھ دیکھ کر افسردہ ہوتی ہیں......" اور اس کی نظر اپنے پاؤں کو دیکھتی' پاؤں کی بوائیوں میں گر گئی۔

"ساؤ" اس کے شریکے کا دیور تھا' بالکل نوخیز تھا' جب اس نے سفید تکیہ سبز کاشنی دھاریوں سے مور کاڑھتی بھابھی کو دیکھا تھا' تو اس کو بھابھی مورنی کہہ کر بلایا تھا۔ غریب گھر سے آئی' اور غریب گھر میں بیاہی جندو کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سوئی' ساؤ کی آواز سن کر

واقعی دھاریوں کا رقص ڈالنے لگی۔ اس نے تکیئے ختم کر کے جب چھیس کی ململ کا دوپٹہ شروع کیا' تو اس پر طرح طرح کے پھول ڈالنے کی بجائے --- مور کاڑھنے لگی' اس کے اسی سر کے پلو سے سارے گاؤں میں اس کا نام بھابھی مورنی پڑ گیا تھا۔

دیکھتے دیکھتے ساؤ کی شادی ہوئی' اس کے گھر اوپر تلے تین بیٹے پیدا ہوئے' تو بھابھی مورنی ان کو چوم چوم کر کھلاتی رہی' اس کی اپنی زندگی بے اولاد گزرتی جاتی تھی' گاؤں کی کوئی بزرگ عورت افسوس کرتی' تو وہ ساؤ کے بیٹوں کو گھٹنوں پر بٹھا کر دہی شکر کھلاتی ہنس کر کہتی --- "نہ بے بے کوئی افسوس نہیں' عورت کو یہی افسوس ہوتا ہے نا کہ بڑھاپے میں جب گھٹنوں میں پانی پڑ جائے گا' اس وقت..... اری اس وقت تر معلہ ہی کھانا ہوتا ہے نا......" اور وہ ساؤ کے بیٹوں کا منہ چومتی کہتی --- "یہ دیکھ میرے ہرڑ' بیہڑے' آملے' ماشہ پیار کی چٹکی بھی نہ دیں گے؟"

"اری اس کے گھر دیر ہوتی ہے' اندھیر نہیں۔" کہنے والی دل رکھنے کو کہہ دیا کرتی تھی' لیکن جب بھابھی مورنی کے آنگن میں رقص کرنے والا اس کے گھر والا مر گیا' تو جس کے گھر سنا تھا' اندھیر نہیں ہوتا' اس کے گھر اندھیر برپا ہو گیا۔

"مورنی تو پاؤں کو دیکھ دیکھ کر افسوس کرتی ہے' لیکن جب عورت کو افسوس کرنا پڑتا ہے' تو ماتھے کے نصیب دیکھ دیکھ کر افسوس کرتی ہے...." وہ جب خدا کا اندھیر برداشت کرنے کے قابل ہو گئی تھی' تو اٹھتی بیٹھتی کے منہ سے یہی نکلتا تھا۔

غم جب اترتا ہے' تو عورت کی چھاتی میں اترتا ہے' اور مرد کے ہاتھوں میں' ساؤ سخت محنت کر کے اپنے کھیتوں کو بوتا' اور بھابھی مورنی کے کھیتوں کو بھی۔ جو کمی خدا نے پیدا کر دی تھی' اس کو آدمی کی ذات پورا نہیں کر سکتی تھی' لیکن اور کوئی کمی اس نے بھابھی مورنی کو نہیں آنے دی تھی۔ "بچوں کے چولہے آگ تو جلائے گی' ورنہ سوکھی آدھی کھا کر پڑی رہے گی۔ ساؤ دل میں سوچتا اور بچوں کو بہانے بہانے اس کے گھر بھیجتا تھا۔ ویسے بھی ایک دیوار کا فاصلہ تھا --- بچے کئی دفعہ دیوار کے اس طرف سوتے' اور اس طرف جاگتے' سوئے ہوؤں کو ان کی ماں اٹھا کر لے جاتی تھی۔" بھابھی مورنی کندھے سے لگا کر چھوڑ آتی تھی۔

اور پھر اچانک ساؤ کی بیوی اپنے میکے اپنے باپ کی وفات پر گئی' جیسے اپنے مرنے پر گئی

ہو۔ ایک ہی رات میں اس کے کلیجے درد اٹھا۔۔۔۔ بہت اذیت ناک' جس نے دوسرا دن نہ دیکھنے دیا' "اس کی موت اس کو بلاتی تھی۔" کہتے اور بلکتے اس کے میکے' سسرال اس کو رو بیٹھے' اور ساؤ کو اگلی سوچ آئی تھی۔۔۔۔ اس کے بچوں کا کیا بنے گا؟ اس نے بھابھی مورنی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔۔ "یہ تمہارے ہرڑ بھیڑے برباد ہو جائیں گے' ان کو سنبھال لو!"

اس وقت بھابھی مورنی نے رندھی آنکھوں سے بچوں کو تو کلیجے لگا لیا تھا لیکن کہنے لگی۔۔۔۔ "ساؤ تمہارے مجھ پر بڑے احسانات ہیں' میرا روئیں روئیں تمہارے احسانات سے بندھا ہے' لیکن زمانے کا منہ کون روکے گا؟....." اور آگے سے ساؤ کا چہرہ یوں مرجھا گیا تھا' جیسے آگ میں گرم اینٹ پر کسی نے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا ہو۔ زمانہ آنکھوں سے اوجھل تھا' ساؤ آنکھوں کے سامنے تھا۔ بھابھی مورنی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی اور افسردہ ہوتے ہوئے کہنے لگی' "اچھا دیور' میری عزت تمہارے ہاتھ ہے' میں تمہارے بیٹوں کی خدمت سے انکار نہیں کرتی۔"

پھر جس دیور کا فاصلہ تھا' وہ تو ویسے ہی رہا' لیکن دو گھر' بمعہ دیواریں' جیسے ایک ہو گئے۔ بھابھی مورنی نے بچوں کو ماں کی آہ نہ لگنے دی۔۔۔۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں' اس کی بھوک پیاس بھی' بچوں کی بھوک پیاس میں شامل ہو گئی۔ (ویسے تقریباً ڈیڑھ برس کے بعد جو دیوار دونوں گھروں کو الگ کرتی تھی' بارشوں سے گر گئی' تو اس کو دوبارہ بنانے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ پھر ایک جگہ سوراخ سا ہوا تو بچوں نے اس میں سے کود کود کر اس کو زمین کے برابر کر دیا اور اس طرح وہ دیوار' جیسے خود ہی اپنی آنکھوں میں غیر ضروری ہو کر بالکل گر گئی)۔

آہستہ آہستہ لڑکے اس کے کندھوں سے اونچے ہو گئے۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ بھابھی مورنی خود بمشکل لڑکوں کے کندھوں تک پہنچتی۔ ساؤ نے جوگ تو کسی سے نہیں لیا تھا' لیکن گاؤں والے کہتے تھے۔۔۔۔ کہ وہ گزشتہ جنم کا جوگی ضرور تھا۔ اس کا ہر طرز عمل کھرے جوگیوں جیسا تھا۔

"اری جندے! اب پونیاں کس طرح کاتتی ہیں؟" اس طرح کی سوچیں بھابھی مورنی کو بیس برس پہلے نہیں آئیں تھیں' شاید اسکے پاس فرصت نہیں تھی' ان سوچوں کے لئے' لیکن

اب تینوں لڑکے جب شہر چلے گئے' تو اٹھتے بیٹھتے اس کو یہ سوچیں آنے لگیں۔ چھاتی اس گھونسلے کی طرح ہو گئی تھی' جس میں سے پرندے اڑ گئے ہوں......

چھاتی کے شگاف کی طرف دیکھتی وہ آج دلائل میں پڑی ہوئی تھی' کہ بیرونی کنڈی کھٹکی۔

"شاید شہر سے بڑا لڑکا آیا ہو....." اٹھ کر بیرونی دروازے تک پہنچتی نے کتنی ہی سوچیں سوچ لیں' کمبخت' کو بہت کہا تھا کہ بیٹوں کی طرح ماتھے سہرا باندھ کر شادی کرا اور ڈولا گھر لے آ..... وہاں معلوم نہیں کیا کیا' بس خط لکھ دیا کہ شادی ہو گئی ہے..... بس رات کی رات لے کر آیا..... کرانشین سی لگتی تھی..... وہ بھی اچھا اس کی مرضی...... پھر بہت کہا کہ پورے دنوں کی ہو گئی تو گھر چھوڑ جانا وہاں شہر میں کون خیال کرتا ہے..... وہی بات ہوئی' کچی ہڈیوں سے اس نے شاید کیا کھایا اور پیا' بچے کو پیدا کرتے ہی مر گئی..... وہ آج مری کل دوسرا دن..... جلد باز سے چھ مہینے بھی صبر نہ ہوا...... تیسرے ماہ ہی دوسری شادی کرنے کو پھرتا ہے....." لیکن کنڈی کھولی' تو دروازے پر شہر سے آیا بڑا نہیں تھا' ساؤ ہی جلدی گھر واپس آ گیا تھا۔

"تم تندرست تو ہو ساؤ!" بھابھی مورنی گھبرا سی گئی۔

"ویسے تو تندرست ہوں' یونہی تمہارے ساتھ ایک مشورہ کرنا تھا....." اندر داخل ہوتے ساؤ نے کہا' تو بھابھی مورنی نے' اس کی چارپائی کے پائے کے ساتھ بیٹھتی نے پوچھا..... کیا بھلا؟ بڑے کا کوئی خط آیا ہے؟"

"پرانے زمانے میں پریوں کی جان طوطے میں ہوتی تھی---- تمہاری بھی آدھی جان بڑے میں اور باقی آدھی چھوٹوں میں ہے....." ساؤ سوچوں میں ڈوبا بھی معلوم ہوتا تھا' اور خوش بھی۔

"کس لئے! ان کے لئے تو میں زندہ مر گئی---- نالائق کبھی چہرہ دکھانے بھی نہیں آتے....." بھابھی مورنی نے شکوہ کیا۔

"تم خوش نہیں کہ تم کو مشکل سے ان سے فرصت ملی ہے؟ ان کے پیچھے تم نے ہڈیاں گلا لیں۔"

"اب فارغ ہو کر میں نے اپنا اچار ڈالنا ہے؟"

"اچھا پھر نہ فارغ ہو! بڑے کا خط آیا ہے کہ اس نے دوسری شادی کرانی ہے' اور اس کی نئی منگیتر اس کے لڑکے کو رکھنے پر رضامند نہیں....."

"ہائے میں مرجاؤں---- کوئی بچوں سے بھی بیزار ہوتا ہے......"

"وہ لکھتا ہے کہ اگر تم کہو تو لڑکے کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤں......"

بھابھی مورنی کے دل میں پریشانی پیدا ہوئی' کہنے لگی "ساؤ! تمہاری کوئی عمر تھی' جب تمہاری بیوی مر گئی' لیکن تم نے نہ سوچا کہ گھر کو پھر سے آباد کر لوں۔ اب دیکھ لڑکے سے چار دن نہیں کاٹے گئے....."

"میری بات اور تھی!" ساؤ نے ایک بہت آہستہ سی آہ بھری۔

"کیوں تمہاری بات کس طرح سے اور تھی؟ تم تو اپنے بیٹوں سے بھی بڑھ کر تھے....."

"اچھا!" ساؤ کو ہنسی سی آ گئی' اور اس کی آواز اس کے حلق سے گھر گئی' "لیکن تو نے اس وقت مجھ کو یہ بتایا ہی نہیں۔"

"لو' یہ کوئی بتانے والی بات تھی..... تم ایک بار کہتے' میں تمہارے لئے سات ڈولے لے کر آتی......" بھابھی مورنی فخر سے چارپائی کے سرے پر بیٹھ گئی۔

ساتوں سے بڑھ کر ایک چہرہ تھا وہی دیکھ کر سیر ہو لیا کرتا تھا' پھر کہنا کیا تھا....." ساؤ نے سامنے دیوار پر دیکھتے کہا۔

"ارے......" بھابھی مورنی کے سفید بالوں میں سے جیسے بجلی سی گزر گئی۔

"اور یونہی تو جوانی برداشت نہیں کر لی......" ساؤ کے چہرے پر چمک پھر گئی۔

"جو گزر گئی' اچھی گزر گئی' اب بڑھاپے میں......" وہ بے ساختہ سی بولی۔

"اور میں کب کہتا ہوں کہ اچھی نہیں گزری---- تم نے ایک بول بولا تھا---- دیور میری عزت تمہارے ہاتھ ہے---- تو تمہارا بول پورا کیا......"

ساؤ کی چھاتی شاید آج بادل کی طرح پھٹ رہی تھی......

بھابھی مورنی کتنی دیر زمین کی طرف دیکھتی رہی' پھر زمین کی طرح ساکن ہو گئی------ "اچھا ساؤ! جو بات ساری عمر نہیں سوچی' اب کیوں سوچی ہے۔"

ساؤ کتنی دیر تک تالو کے ساتھ زبان پھیرتا رہا' پھر کہنے لگا' "اچھا' بتا پھر لڑکے کا کیا

کریں؟"

بھابی مورنی آہستہ سے بولی" "لڑکے کا کیا کرنا ہے' گھر لے آؤ' وہ یہاں پیڑھی پر پڑا ہو گا' تو گھر پھر آباد لگے گا......"

ساؤ نے اٹھ کر کارڈ پر دو حروف لکھے' اور پھر فارغ سا ہو کر روزانہ کی طرح اپنے کونے میں بیٹھ کر شراب کا گھونٹ پینے لگا۔ بھابھی مورنی نے روزانہ کی طرح چولھے پر دال رکھی' اور پھر فارغ سی کھڑی کو نہ معلوم کیا خیال آیا' چھاتی سے ایک شعلہ سا اٹھا۔۔۔۔۔۔ اور اس نے مٹی کے چولھے میں چند لکڑیاں ڈال کر تیل کی کڑاہی رکھی اور پیاز کے چھوٹے چھوٹے پکوڑے تل کر' شراب پیتے ساؤ کے قریب رکھ آئی......

پانچویں دن بڑا لڑکا شہر سے آیا' اور صرف ایک رات رہ کر' وہ جب چار ماہ کے ننھے سے بچے کو بھابھی مورنی کی جھولی میں ڈال کر چلا گیا' تو بھابھی مورنی نے سفید زیرے کو پھانک کر بچے کو چھاتی سے لگا لیا۔

گاؤں کی یہ حکائیت ابھی بھی سنائی دیتی ہے کہ ساؤ کا وہ پوتا پورا ایک برس بھابھی مورنی کا دودھ چوستا رہا......

مربعوں والی

وہ جب آہستہ سے ڈولی سے اتری تھی' اس وقت ہی سارے گاؤں کے منہ پر اس کا نام چڑھ گیا تھا---- مربعوں والی۔

صرف زمین کے کاغذات میں اس کا نام "سردارنی راج کور" لکھا ہوا تھا' یا اس کا سسر جتنی دیر زندہ رہا تھا' اس کو سردارنی راج کور کہتا رہا تھا' لیکن جہاں تک شریکوں کا اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کا سوال تھا' وہ سب کے لئے مربعوں والی تھی۔ اس کے امیر باپ نے ایک مربعہ جہیز میں دیا تھا' لیکن بغیر نام کے بھی سب کو معلوم تھا کہ بقایا تین مربع زمین کی بھی وہی وارث تھی۔ اس کے بارے زبان خاص و عام تھا کہ اس کی ماں جب چالیسواں نہائی' اس کو کمخواب میں لپیٹ کر گوردوارے ماتھا ٹکانے لے گئی تھی' اور اس کے باپ نے اس کے ہاتھوں سونے کی گیارہ اشرفیاں گوردوارے کو بھینٹ کی تھیں' اور اسی دن گوردوارے کے بھائی جی نے اس کو مربعوں والی کہہ کر ایک خالص گوٹے والا دوپٹہ گورو مہاراج کو چھوا کر اس کے لئے سروپا دیا تھا۔

وہ کھاتے پیتے گھر پیدا ہوئی تھی' کھاتے پیتے گھر شادی ہوئی۔ لیکن جو ایک دکھ اس نے خاموشی سے برداشت کر لیا تھا' اس کو اس سے اور اس کے سچے خدا کے بغیر کوئی نہیں جانتا تھا۔ تازہ بیاہی کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے مرد حاکم سنگھ کے اپنے دادے پوتے کے ناطے بھائی لگتے کرم سنگھ کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ بعد میں اس نے اس بات کی مین میخ بھی نکالی تھی کہ جب تک کرم سنگھ زندہ رہا' اس وقت تک تو ڈھکی پکتی رہی' لیکن جس دن کا وہ خدا کو پیارا ہو گیا تھا' اس کی بیوی نے رشتہ داروں میں سے دیور لگتے اس حاکم سنگھ کے دو کپڑے نکلوائے تھے۔

یہ مربعوں والی' خدا کی بندی' کبھی منہ سے نہ بولی۔ صرف گوردوارے جا کر اپنے سچے

خدا کے آگے بول پڑی "زمین و آسمان کے جاننے والے! میں نے تو اس کو سچے انگ دیئے تھے' لیکن ناپاک نے وہ بھی ناپاک کر دیئے۔"

اور اس کا مرد جس رات اس کے بستر پر آتا' وہ اس صبح مل مل کر نہاتی اور دن چڑھے سارا بستر دھلوا چھوڑتی۔ روزانہ پانچ پوڑیاں پڑھتی' لیکن دن نہار منہ ساری سکھ منی کا پاٹھ کرتی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے زندہ مکھی نگل لی تھی' لیکن اپنے مرد کو منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کو بھی شاید اندر کا خوف مارتا تھا' اس نے اپنی اس سرداری کے آگے کبھی آنکھ نہیں اٹھائی تھی۔ لیکن مرد کی یہ بات بھی اس کو رستے پھوڑے کی طرح لگتی تھی' اور اس کا دل متلا جاتا۔

لیکن اس کے دل میں ٹھہراؤ آگیا' جب اوپر تلے اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ اس کو محسوس ہوا ---- اس کو بالکل اکیلی کو خدا نے لوہے کے دو بازو دیئے ہیں۔ پھر اس کے بیٹی پیدا ہوئی' جس کو وہ پیار سے ملکی کہہ کر بلاتی رہی۔ چاہے بعد میں گورو گرنتھ میں سے اس کا نام نکلوایا' وہ کچھ اور تھا' لیکن جو پہلے دن اس کے منہ چڑھا تھا وہی پھر سب کے منہ چڑھ گیا تھا۔

وقت اچھا بھلا اپنے دھیان چلتا جا رہا تھا' لیکن پوُلے جیسی ملکی جب بڑی ہو گئی' سکول پاس کرنے کے قابل ہو گئی' تو وقت نے کچھ اس طرح کا پلٹا کھایا کہ کیا شریک بھابھی اور کیا کوئی اور' جو کبھی اس مربعوں والی کے سامنے آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی تھی' لگا لگا کر باتیں کرنے لگی۔

ملکی نے ضد پکڑ لی تھی کہ وہ سکول پاس کر کے شہر جائے گی' اور پڑھے گی۔ یہاں تک تو بات قابل برداشت تھی کہ ملکی کے دل میں جو کچھ بھرا تھا وہ سکول کے جوان ماسٹر نے اس کو کوئی الٹی سیدھی کتابیں پڑھا کر بھرا تھا' لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی تھی۔ لوگ ملکی کی اور ماسٹر کی آشنائی جوڑنے لگے تھے۔

ایک دفعہ تو گلی میں سے گزرتے ہوئے راج کور کے کان میں آواز پڑی' جو صاف نظر آتا تھا کہ گاؤں کی نامو شریکن نے اسی کو سنانے کے لئے کہی تھی "اری' میں نے آم کا آچار

ڈالا بہت اچھا زرد زرد' میں نے سوچا چار پھانکیں ماسٹر جی کو بھی دے آؤں' یونہی خیال آگیا' لیکن بامراد کہتا ہے میں آچار نہیں کھاتا۔ ہاں جی! آچار کیوں کھائے' وہ تو غریب غربا کھاتے ہیں' وہ تو کوئی مرتبان توڑے گا مربہ کھائے گا......"

بات چاہے کھانے والے مربے کی تھی' لیکن راج کور سمجھ گئی کہ یہ بات اسی کے مربعوں کو لگا کر سنائی گئی تھی۔ لہو کے گھونٹ کی طرح پی گئی' لیکن ندی کی طرح چلی ہوئی بات کے آگے کانوں کا دروازہ بند کرنے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن وہ اس کی شریک بھابھی منہ پھاڑ کر کہنے لگی' "---کیا حال ہے لڑکی کا' دل راضی نہیں اس کا؟ کہتی تھی بدن ٹوٹتا ہے....." اور جب سردارنی نے آگے سے بات پر توجہ نہیں دی تھی' تو خود ہی بول پڑی تھی' "اسکول گئی ہوگی---بھئی بدن کو حرارت مل جائے گی....."

اس دن سردارنی راج کور چنے کی دال کی طرح ایسا تاؤ کھا گئی کہ چھم چھم روتی ملکی کو دیکھ کر بھی اس کے دل کا دانہ گلنے میں نہ آیا تھا۔ اور اس کے حامی بھرنے پر ملکی کے باپ نے جہاں چاہا تھا' وہاں ملکہ کا رشتہ پکا کر دیا تھا۔

دروازے پر برات آنے والی تھی' گنتی کے دن رہ گئے تھے۔ جب ملکی نے ایک دن پیپل کے پتے کی طرح کانپتی ماں کو اندر بلا کر کہا کہ اس کے دل میں جو مرد تھا' وہ ماسٹر تھا' اب اس کے دل میں اور کوئی نہیں سمائے گا۔ لیکن راج کور نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر اپنی عزت کا واسطہ اس طرح ڈالا تھا--- جیسے ملکی نے بیل کے سینگوں کی طرح دھرتی سر پر اٹھائی ہو' اور جس کے ذرا سے ہلنے سے ساری دھرتی ہل جاتی ہو۔

تو ملکی نے بیل کے سینگوں کی طرح دھرتی سر پر اٹھالی تھی۔ گھر کی عزت قائم رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے ڈولی میں بیٹھ گئی تھی اور تمام شریکوں کو مرگی پڑ گئی تھی۔

وقت پھر اپنی رفتار اور توجہ سے چلنے لگا تھا۔ یہ بات اور تھی کہ ملکی اپلوں کی طرح جلتی رہی اور اس کا دھواں اس کے ماں باپ کے دروازے پر بھی پہنچتا اس کی ماں کی آنکھوں کو بھی لگتا رہا۔ لیکن ہارے کی آگ پر دال پکتی رہی' دودھ ابلتا رہا' بیٹے بیٹیاں پیدا ہوتے رہے......

لیکن پھر پچیس برس کے بعد--- اچھے بھلے چلتے وقت نے اس طرح کروٹ بدل لی کہ

ملکی کے سسرال والے بھی اور ملکی کے میکے بھی برچھیاں چمک گئیں۔ ملکی کی پلوٹھی کی بیٹی صاحب کور، جس کو سب پیار سے صاحباں کہتے تھے اور جو گزشتہ چھ برس سے شہر کالج میں پڑھتی تھی، جب پڑھ کر گھر آئی، تو اس نے ماں باپ کو کہہ دیا کہ وہ اپنی مرضی کے آدمی کے ساتھ بیاہ کرے گی۔ اور معلوم ہوا تھا کہ اس کی مرضی کا آدمی مذہبیوں کا ایک لڑکا تھا، جو اس کے ساتھ ہی اس کے کالج میں پڑھتا تھا، اور اب آئندہ تعلیم کے لئے معلوم نہیں کون سے ملک چلا گیا تھا.....

صاحباں کے بھائی چھوٹے تھے، لیکن باپ اور چاچے ابھی بھی لوہے کی لاٹھوں کی طرح تھے، اور دوسری طرف صاحباں نے ماتے پاؤں کی ایڑی سے دھرتی پھاڑتے تھے، اس لئے ایک قہر بچ گیا۔

گھر کی بیٹی اپنے ہاتھوں سے ماری نہیں جا سکتی تھی، لیکن مذہبیوں کا لڑکا ختم کیا جا سکتا تھا۔ تو منصوبے بننے لگے۔ لڑکی کو اندر بیٹھ کر سمجھایا گیا تھا، لیکن وہ بجلی کے ننگے تار کی طرح کسی کا ہاتھ نہیں لگنے دیتی تھی۔ اس نے دوسرا بھید بھی پا لیا تھا---- چمک کر بولی، "اگر اس آدمی کا ابال بھی بیکا ہوا تو وہ خود کچہری میں جا کر گواہی دے گی۔"

ملکی لڑکی کے آگے ہاتھ باندھتی رہی، لیکن صاحباں پر یہ جادو بھی نہیں چلتا تھا، صاحباں کے باپ کو بھی محسوس ہوا---- کہ وہ سارے ہوا کو تلواریں مار رہے ہیں۔ اس لئے ہار کر اس نے سردارنی مربعوں والی کو واسطہ لکھ بھیجا کہ وہ کسی طرح یہاں آئے، اور لڑکی کو سمجھائے، اگر یہ جاٹوں کی لڑکی مذہبیوں کے جا آباد ہوئی، تو آخر یہ اسی کے نام کو بٹہ لگنا ہے......

سردارنی راج کور بمعہ بیٹوں کے آئی۔ آپ پالکی میں اور بیٹے گھوڑیوں پر سوار۔

ابھی دور کچے راستے پر سموں کے لشکارے چمک رہے تھے کہ صاحباں کے باپ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کو امید بندھی کہ اب ہوا کے گھوڑے پر سوار اس کی مربعوں والی لگام ڈال لے گی۔

راج کور آئی، وہ ابھی تک چاہے اکہرے بدن کی تھی، مگر صحن میں برگد کی طرح بیٹھی، اور اس نے لڑکی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ملکی کو امید بندھ گئی کہ اب اس کی ماں---- لڑکی

کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ اس طرح کا کہے گی کہ لڑکی خاموشی سے بیل کے سینگوں کی طرح دھرتی کو سر پر اٹھالے گی......

قریب صحن میں چارپائیوں پر صاحباں کے باپ اور بھائی بھی تھے اور مامے بھی۔ لڑکی اپنی نانی کے گھٹنے کے پاس بیٹھی دل کی بات بتا رہی تھی۔ راج کور صبر سے کتنی دیر تک سنتی رہی۔ ہنکارا بھرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی' صرف کبھی غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ لیتی۔ باقی کے سب صرف راج کور کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اور پھر وہ لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی---- "سن لڑکی! اگر دل پکا ہے' تو دل کی کر لو! ورنہ ساری عمر اندر بند ہو کر اپلوں کی آگ کی طرح جلتی رہو گی۔"

"ماں!" لڑکی کے منہ سے کانپ کر نکلا اور وہ سرسوں کی گندل کی طرح زرد ہوتی نے پہلے صاحباں کے باپ کی طرف دیکھا' پھر اس کے ماں باپ کی طرف۔

"اری' تم ان کا فکر نہ کرو۔" راج کور چمک کر بولی' "میں جو کہہ رہی ہوں---- یہ میرے پیدا کردہ اور میرے انتخاب کردہ میرے آگے بول سکتے ہیں؟"

اور وہ صاحباں کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہنے لگی' "اٹھو! اپنے پکھ لگتے کو خبر کر دو کہ برات بنا کر لے آئے! میں خود تم کو رخصت کر کے جاؤں گی۔" اور پھر دیواروں سے پار دیکھتی کہنے لگی' "لوگوں کا کیا ہے' چار دن بول کر خود ہی کانٹوں کی آگ کی طرح بجھ جائیں گے۔"

اور وقت کروٹ بدلتا مربعوں والی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

فرائڈ سے لے کر......

"دھرتی کی طرح شائد ہر چیز گول ہوتی ہے' انسانی امید بھی گول ہوتی ہے۔" اچلا نے اپنی بچی کو بہلاتے لکڑی کی بھمیری کو زور سے گھمایا' بچی بڑی مست ہو کر بھمیری کو دیکھنے لگی' اور اچلا سوچنے لگی' "امید کے گول راستے پر چلتے چلتے برسوں کے بعد کوئی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے' جہاں سے کبھی اس نے چلنا شروع کیا تھا۔ پاؤں ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دراصل پاؤں کھڑے نہیں ہوتے' راستہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ پاؤں صرف ٹھٹھک جاتے ہیں' لیکن خاموشی سے کھڑے ہو جانا' تب بھی کوئی بات نہیں' لیکن پاؤں کی اس ٹھٹھک کا کوئی کیا کرے؟" اچلا کو محسوس ہوا کہ سوچوں کی ایک گہری سی دھند ہر وقت اس کی آنکھوں میں چھائی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا جی بھر کر رونے کو دل کرتا ہے' لیکن وہ کبھی روئی نہیں۔ آج اچلا کو محسوس ہوا کہ وہ رونے سے ڈرتی ہے۔ اگر وہ جی بھر کر رو لیتی تو یہ دھند بھی شائد اس کی آنکھوں سے دور ہو جاتی' یوں جیسے بارش برسنے کے بعد سارا آسمان صاف ہو جاتا ہے...... لیکن اگر دور تک سب کچھ دکھائی دینے لگ جائے تو بند راستے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں...... اچلا بند راستے کو دیکھنے سے ڈرتی تھی' اس لئے دھند اس کو بڑی راس آئی ہوئی تھی۔ دھند میں ایک غلطی فہمی ہر وقت قائم رہتی ہے' کہ اگر آگے کچھ نہیں دکھائی دے رہا تو یہ دھند کا قصور ہے' راستے کا قصور نہیں' کوئی راستہ ضرور کہیں ہو گا۔ یقینی طور سے یہ معلوم کر لینا کہ آگے کوئی راستہ نہیں' دھند کی دی ہوئی بے اعتمادی راس آتی ہے...... اس لئے اچلا جیسے پہلے کبھی نہیں روئی تھی' آج بھی نہ روئی اور اب لحہ بھر پہلے لکڑی کی بھمیری کو گھماتے اس کو جو خیال آیا تھا کہ دھرتی کی طرح شائد ہر چیز گول ہوتی ہے' امید بھی گول ہوتی ہے...... اس نے جلدی سے بھلا دینا چاہا۔ بچی بھمیری کے کھیل سے بڑی بہل گئی تھی' اپنی چھوٹی انگلیوں سے رنگ برنگی بھمیری کو گھمانے کا طریقہ سیکھتے سیکھتے وہ رونا بھول گئی

میں نے اس کے اقوال کا اس کے شاعری سے مقابلہ کیا' تو اس کے معنی ہی نہ ملیں۔ اس کے غرور کے پتھر نے اس کی کشتی الٹا دی' اور اس کی تصویر بھی میں نے ڈوبی ہوئی کشتی کی طرح الٹی کر دی۔ موہن سنگھ کی تصویر میں نے بڑے عرصے سے دیوار پر لگائی ہوئی تھی' اس وقت سے جس وقت سے اس نے "رب" اور "نورجہاں" جیسی نظمیں لکھیں تھیں۔ روزن برگ کی موت پر بھی اس نے خوبصورت نظم لکھی۔ اس کی "سویر" نظم میں منہ زبانی لوگوں کو سنایا کرتا تھا ------ جس میں مشرق کی لڑکی دودھ بلونے بیٹھتی ہے ------ مگر گزشتہ دنوں جب "نانکائن" میں واقعات لکھنے لگا' اور قافیے جوڑ جوڑ کر صفحوں کے صفحے بھر دیئے' تو میں نے ایک دن غصے میں آ کر اس کی تصویر الٹی کر دی۔"

"یہ تو ہو گئی اٹھ تصویروں کی تاریخ۔" جوگا سنگھ کے دوستوں میں سے ایک نے انگلیوں پر گن کر حساب لگایا' اور پھر کہا' "باہر دیوار پر نو گنی تھیں۔ ایک شائد کرتار سنگھ دگل کی ہے۔"

"نہ' نہ' اس کی تصویر تو میں نے کبھی دیوار پر لگائی ہی نہیں تھی۔ ویسے ------ پوری نو ہیں' نویں امرتا پریتم کی ہے۔ اس کا "پنجر" ناول پڑھ کر میں نے اس کی تصویر دیوار پر لگائی تھی۔ پھر نظمیں بھی پڑھی تھیں' "حسن و عشق کی باتیں او لڑکے فرصت کے وقت کی باتیں" اور "حق جنہوں کے وہ خود لیں گے چھین" اور پھر جب اس نے "میں تاریخ ہاں ہند کی" لکھی ------ تو لکھا "آج حسن بھوکا رو ٹیے' پیار بھوکا گوریئے' کس طرح کا درخت ہے نظام کا' پھل کوئی لگتا ہی نہیں ------" میں نے سوچا ------ وہ اچھی شاعرہ ہے۔ لیکن گزشتہ دنوں جب اس نے ۱۹۶۸ء کے حادثے کے وقت چیکوسلاویکیہ پر نظمیں لکھیں' تو میں نے اس کی تصویر اسی دن اپنی دیوار پر الٹی کر دی۔"

"شاباش بھئی جوگیا!" جوگا سنگھ کے دوستوں کو رات والی شراب جیسے ایک بار پھر چڑھ گئی۔ اس کی باتوں نے ان کی آنکھوں میں سرخ ڈوریاں کھینچ دی تھیں۔

جوگا سنگھ ایک گھوڑ سوار کی طرح تنا تنا اور خوش تھا۔

دوستوں میں سے ایک کو آئندہ کی سوجھی' "اب تم نئے شاعروں کی تصویریں دیوار پر لگا دا' یہ رومان پرست' تصور پرست اور ترقی پسند اسی طرح الٹے لٹکا دو۔ تجربہ پرست بھی جیسے

تھی۔ اچلا بچی کے پاس سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

اچلا کے دل میں گناہ کا ایک ہلکا سا احساس آیا' اور اس کی آنکھوں میں چھائی ہوئی سوچوں کی دھند کو اور گہرا کر گیا' میرا چھوٹا سا اپنا گھر ہے' میرا خاوند کماؤ بھی ہے' خوبصورت بھی' اور میرے دو بچے ہیں۔۔۔۔۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔۔۔۔۔ مجھے اور کیا چاہیے؟ اچلا نے اپنے آپ سے سوال کیا' اور اپنے آپ کو جوابدہی کے کٹہرے میں کھڑا کر کے دیکھنے لگی۔

جوابدہی کے کٹہرے میں کھڑی ہوئی اچلا کے پاس جواب کوئی نہیں تھا' لیکن اس کا چہرہ معصوم بھی تھا' اور سادہ بھی' اس لئے قصوروار ہونے کا جو ہلکا سا الزام اس پر لگتا تھا' وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھہرتا نہیں تھا۔ اگر کہیں ٹھہرتا تھا' تو گرفت میں نہیں آتا تھا......

اچلا مزید سوچوں میں پڑنے کی بجائے ایک انگریزی رسالے کے صفحات الٹتی اس میں سے پڑھنے کے لئے کہانی تلاش کرنے لگی۔ ایک کہانی کا عنوان اچلا کو بڑا دلچسپ معلوم ہوا' "بیٹی میٹس ہر ڈریم بوائے۔" اور کہانی کو پڑھتے پڑھتے اچانک اچلا کو خیال آیا کہ اس کی اداسی کی وجہ اس کو معلوم ہو گئی ہے۔ اس نے کبھی کسی کو محبت نہیں کی' کبھی کسی کے چہرے کو ترس کر نہیں دیکھا' اور اس کی طرف بھی کبھی کسی نے اس طرح تڑپ کر نہیں دیکھا کہ اس کا چہرہ ایک معمولی عورت کے چہرے کی بجائے کسی پری کا یا کسی شہزادی کا چہرہ بن جاتا...... اس کا اپنا خاوند اچھا لگتا تھا' لیکن یہ اچھا لگنا اس کے دل کے درد میں پیدا نہیں ہوا تھا۔۔۔۔۔ یہ زندگی کی ضرورتوں میں سے پیدا ہوا تھا۔۔۔۔ گھر کی اور حفاظت کی ضرورتوں میں سے......

"ضرورتوں کی تکمیل ہونٹوں کی پیاس کو بجھانے والا پانی ہوتا ہے۔" اچلا نے سوچا اور سوچا "پانی میں ایک معمولی آسودگی ہوتی ہے' لیکن نشہ نہیں۔ رومانس ایک نشہ ہوتا ہے' یہ نشہ رات کی گہری نیند میں خواب بن کر بولتا ہے' دن بھی بیداری میں ہونٹوں کے گیت بن کر بولتا ہے۔۔۔۔۔ یہ مرد کے سر چڑھ کر بولتا ہے' یہ عورت کی چھاتی میں اتر کر بولتا ہے۔۔۔۔" اور اچلا کو محسوس ہوا کہ اس کی اور اس کے خاوند کی سرد زندگی کی بنیادی وجہ یہی تھی' کہ انہوں نے کبھی اس نشے کا گھونٹ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کو ایم۔ اے میں پڑھتی کو کالج میں سے اٹھوا کر اس تنویر نام کے ساتھ بیاہ دیا گیا کہ اس طرح کا اچھا وقت ہاتھ

سے جانے نہیں دینا چاہئے تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور اس تنویر نام کے آدمی کو جب اچھی ملازمت مل گئی تھی' تو اس کو اس اچلا نام کی تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی سے بیاہ دیا گیا تھا' کہ کمانے والے مرد کا گھر جلدی آباد ہو جانا چاہئے' ورنہ اس کو کوئی عیب لگ جاتا ہے۔ تو اس طرح تنویر اچلا کی ساری عمر کے گزارنے کا ذریعہ بن گیا تھا' اور اچلا تنویر کو عیبوں میں پڑنے سے بچانے کا ذریعہ۔ اور اچلا کو جہاں اپنے آپ پر ترس آیا' اپنے خاوند پر بھی ترس آ گیا۔ ترس میں ایک پیار بھی شامل ہوتا ہے' اچلا کو اپنے آپ سے بھی پیار آیا اور اپنے خاوند کے ساتھ بھی......

لیکن جو پیار ترس میں شامل ہوتا ہے' اس میں ایک بے بسی شامل ہوتی ہے یہ بے بسی اگر ایک پل پیار کی صورت اختیار کرتی ہے' تو دوسرے پل غصے کی۔ اچلا کو اپنے آپ پر بھی غصہ آ گیا' اور اپنے خاوند پر بھی۔ "شادی کی ایک رسم نے اس نشے کو ہمیشہ کے لئے ممنوع کر دیا ہے۔" اچلا نے ایک ہچکی کھا کر سوچا' "دنیا میں ہزاروں ہی پیالے نشے سے بھرے ہوئے ہوں گے' اور ان کو پینے کے ہزاروں ہی مواقع' لیکن شادی کی ایک رسم کے بعد نشے کا پیالہ بھی ممنوع ہو جاتا ہے اور موقع بھی۔ اور چاہے پیالے اور مواقع دونوں چیزیں دو بالشت کے فاصلے پر پڑی ہوئی ہوں....."

اچلا کو بادلوں میں چھٹتی ایک بجلی کی چمک کی طرح اپنا نیا ہمسایہ یاد آیا۔ پورے دو مہینے ہو گئے تھے' اس کو وہاں رہتے۔ پہلے پانچ دن تو معلوم نہ ہوا کہ وہ کون تھا۔ گھر میں آتے وقت بھی وہ اکیلا ہوتا تھا' جاتے وقت بھی۔ شائد اس نے ضرورت کی چیزیں جمع کر کے اپنے کنبے کو گاؤں سے لانا تھا۔۔۔۔ مگر پھر چھٹے دن اس کے دروازے کے آگے اس کے نام کی پلیٹ لگ گئی تھی۔ اس کا نام معلوم ہو گیا تھا' راج ورما' اور اس کے ساتھ اچلا کے باپ کو باتیں کرتے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا' کہ وہ ایک اخبار میں بطور پریس رپورٹر کام کرتا ہے۔ شادی شدہ نہیں۔ رات کو بڑی دیر سے کام ختم کر کے گھر واپس آتا' صبح دیر تک سوتا' اور دوپہر کو کھانا کھا کر گھر سے جاتا...... اور اچلا کو اس کی پیاسی پیاسی آنکھیں یاد آئیں..... اچلا کے کمرے کی ایک کھڑکی اس کے صحن کی طرف کھلتی تھی' اور صبح گیارہ بجے جب اچلا گھر کے کام ختم کر کے' اپنے خاوند کو روانہ کر کے' اپنے بیٹے کو سکول بھیج کر اور اپنی بیٹی کو نہلا دھلا کر اور

پنگھوڑے میں سلا کر اپنے کمرے میں آتی تھی' تو کھڑکی میں سے دیکھ سکتی تھی' کہ راج ورما اپنے صحن میں رکھے ہوئے پام کے بڑے سے گملے کے پاس کرسی رکھ کر اخبار پڑھ رہا ہوتا تھا..... اخبار سے نگاہیں اٹھا کر راج ورما نے کئی بار اچلا کو دیکھا تھا' اور اچلا کو اس کی پیاسی پیاسی آنکھوں سے ایک خوف آیا تھا' اور پھر گزشتہ ماہ سے اچلا نے وہ کھڑکی کھولنا چھوڑ دی تھی...... اور جب سے اچلا نے وہ کھڑکی کھولنا چھوڑ دیا تھا' اس وقت سے وہ راج ورما کی آنکھوں کو بھی بھول گئی تھی' آنکھوں کی پیاس کو بھی' اور پیاس کے خوف کو بھی...... آج اچلا کو اپنے اندر بیدار ہوئی پیاس نے اس کو راج ورما کی آنکھوں کی پیاس کی یاد دلا دی۔

اور پیاس سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اچلا نے سوچا "جو نشہ شادی کی ایک رسم کے بعد بیوی اور خاوند کے لئے ممنوع ہو جاتا ہے' اس کا غصہ وہ دونوں اپنے آپ پر بھی نکالتے ہیں' اور ایک دوسرے پر بھی۔ دونوں اپنے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے ہیں......" اور اچلا نے جاسوسی لفظ کو بڑی نفرت کے ساتھ دیکھتے ڈرائینگ روم میں سے اپنے سونے کے کمرے میں جا کر راج ورما کے صحن میں کھلتی اپنی کھڑکی کو کھول دیا تھا۔

اچلا کو معلوم نہیں اپنے پر غصہ آیا کہ خالی کرسی پر' اس کے ماتھے پر ایک بڑی لمبی تیوڑی پڑ گئی۔ اور پھر اچلا کے ماتھے پر پڑی تیوڑی اس کے ماتھے کی جھرناہٹ بن گئی' راج اپنے کمرے میں سے آ کر اچانک صحن میں کھڑا ہو گیا تھا...... اچلا نے بڑی دیر کے بعد کھڑکی کھولی تھی' بند پڑی ہوئی کھڑکی جب جھٹکے کے ساتھ کھلی تھی' تو شائد اس میں سے نکلتی آواز ایک زور لگا کر راج کے کمرے میں پہنچ گئی تھی' یا شاید اچلا کے دھڑکتے دل کی آواز آہستہ سے راج کے کانوں میں چلی گئی تھی' وہ کمرے سے آ کر کھڑا ہو گیا تھا......

راج نے کھڑکی میں کھڑی ہوئی اچلا کی طرف دیکھا۔ راج کی آنکھیں پیاسی پیاسی بھی تھیں اور جھانکتی جھانکتی بھی۔ اچلا نے اپنے ماتھے کو ہتھیلی سے پونچھا۔ معلوم نہیں کہ وہ ماتھے کی تیوری کو پونچھنا چاہتی تھی کہ ماتھے کی جھرناہٹ کو' مگر اس کو محسوس ہوا کہ اس کی ہتھیلی نے اس کے ماتھے پر سے یہ دونوں چیزیں پونچھ لی ہیں......

ایک ٹیس اچلا کے ماتھے میں پڑی کہ راج ورما کی آنکھیں گستاخ ہیں۔ اور پھر دوسری

ٹیس پڑی کہ راج ورما کی آنکھیں نہیں، آنکھیں تو بڑی خوبصورت تھیں، مگر آنکھوں کی پیاس بڑی گستاخ ہے۔ اور پھر اوپر تلے پڑتی ٹیسوں میں تیسری ٹیس اچلا کے ماتھے میں پڑی کہ راج ورما کی آنکھوں کی پیاس گستاخ نہیں، اس کی اپنی آنکھوں کی پیاس گستاخ ہے۔ اور اچلا نے اس تیسری ٹیس کے ہاتھوں دکھی ہو کر کمرے کی کھڑکی بند کر دی۔

"یہ پیاس میری اپنی ہے۔ میں نے آج تک کسی کو نہیں دکھائی، یہ میں نے اپنے خاوند کو بھی کبھی نہیں دکھائی۔ یہ راج ورما کون ہوتا ہے اس کو دیکھنے والا؟"۔۔۔۔۔ اچلا کو اپنی پیاس پر غصہ بھی آیا، لیکن پیاس سے اپنائیت بھی بڑی آئی۔ اور کچھ دیر پہلے ایک رومانٹک کہانی پڑھتے اس کو جو محسوس ہوا تھا کہ اس کو اس کی اداسی کی وجہ معلوم ہو گئی تھی، اب اس کو محسوس ہوا کہ اس کی اداسی کی وہ وجہ نہیں تھی.....

"کسی کے تڑپ کر دیکھنے سے اگر کسی معمولی عورت کا چہرہ کسی پری کا یا کسی شہزادی کا چہرہ بن جاتا ہے، تو وہ کسی شہزادی سے ادھار مانگا ہوا چہرہ ہوتا ہے..... اور وہ کسی عورت کا اپنا اور اصلی چہرہ نہیں ہو سکتا....." اور اچلا نے ابھی ابھی بنائے، رومانس کے اپنے بنائے فلسفے کو جب اچھی طرح الٹا سیدھا کر کے دیکھا تو اس کو محسوس ہوا کہ رومانس زندگی کے خلا کا فلسفہ ہے، اور غلط فہمی دینے کا اور ایک غلط فہمی لینے کا فلسفہ ہے، یعنی دو غلط فہمیوں کے تبادلے کا فلسفہ۔ یہ اداس چہرے پر ایک ریشمی نقاب ڈال سکتا ہے، اور کچھ نہیں۔ اس کے نشے کو پی کر وجود کے غم کو کچھ دیر کے لئے غلط کیا جا سکتا ہے، اور کچھ نہیں۔ یہ کھڑے ہوئے قدموں میں شائد کچھ حرکت ڈال سکتا ہے، لیکن اس کی دی ہوئی حرکت سے چلا نہیں جا سکتا۔ شائد کچھ دیر رینگا جا سکتا ہے......

اچلا نے نشے اور نقاب کے فلسفے کو رد کر دیا اور غسل خانے میں جا کر ہاتھ دھونے لگی۔ شائد راج ورما کی آنکھیں اس کو اپنے چہرے کے بہت نزدیک آگئی معلوم ہوئی تھیں، شاید کہیں چھو گئیں، اور وہ پانی سے اچھی طرح اپنے چہرے کو دھو کر اس کے چھونے کو اتار دینا چاہتی تھی۔۔۔۔۔

بڑے دھوئے اور پونچھے ہوئے چہرے سے اچلا نے جب آئینہ دیکھا تو تازہ چہرے کی طرح اس کو ایک تازہ خیال آیا، کہ اس کی اداسی کی وجہ شائد یہ ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے اس

کی زندگی ایک اصول پر بندھی ہوئی چل رہی ہے۔ روزانہ کے سارے کام اس کے ہاتھوں کو گھڑی کی سوئی کی طرح چلاتے ہیں' وہ وقت پر چائے بناتی ہے' وقت پر کھانا تیار کرتی ہے' وقت پر بچوں کے کپڑے دھوتی ہے' وقت پر بچوں کے کپڑے سیتی ہے۔ بیٹے کو سکول سے آنے کے وقت وہ اندرونی دروازے میں کھڑی ہوتی ہے...... خاوند کے دفتر سے آنے کے وقت وہ بیرونی دروازے میں کھڑی ہوتی ہے...... اور یوں چاہے کوئی شکائت اس نے اپنے گھر میں نہیں آنے دی' لیکن شکائت کی جگہ ایک سل اس کے گھر میں آگئی ہے......

اور اچلا نے سوچا کہ اس دفعہ چھٹیوں میں وہ اپنے خاوند کو دو ہفتوں کے لئے کسی پہاڑ پر جانا رضامند کرلے گی۔ اور ساتھ ہی اگر خاوند نے اس کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی تکلف نہیں کیا تھا' تو یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس نے کبھی خود کوئی تکلف کرکے اس کی توجہ مبذول نہیں کرائی تھی۔ اور اچلا کو یاد آیا کہ ایک دن اس نے کسی انگریزی اخبار میں ایک آرٹیکل دیکھا تھا' "خاوند کو بس میں رکھنے کے باون طریقے۔" اس نے اس دن اس بات کو ہنسی میں اڑا دیا تھا' لیکن آج اچلا اس مضمون کو پڑھنے کے لئے اس نے ڈرائنگ روم میں جاکر کتابوں کی الماری کھولی۔ نچلے خانے میں بہت سے اخبار اور رسالے پڑے تھے۔ اچلا ان کو الٹتی پلٹتی رہی' اور پھر اس نے وہ آرٹیکل ڈھونڈ لیا۔ پڑھتے پڑھتے اچلا کی بے تابی پہلے سرد سی ہوئی' پھر سکڑتی سکڑتی ایک وزنی بوجھ بن کر اس کے ماتھے میں بیٹھ گئی' بکواس...... زندگی کیا ہوئی' صرف نمائش ہو گئی...... کبھی کپڑوں کی نمائش' کبھی بالوں کی نمائش' کبھی لفظوں کی نمائش......" اور اچلا کو اس سب کچھ کے پیچھے رہنے والے' یا سب کے آگے رہنے والے انگوں کی نمائش کے فلسفے سے کراہت آگئی۔ اس کو ایک امریکن لڑکی کا ایک خط یاد آیا' جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی' اور اس نے واپس اپنے ملک جاکر اس کو لکھا تھا' "ہمارے ملک میں ہر لڑکی کی زندگی ایک لمبا فکر ہے۔ ایک فکر شادی سے پہلے اور ایک فکر شادی کے بعد۔ شادی سے پہلے اس کو ایک خاوند ڈھونڈنے کا فکر ہوتا ہے' اور شادی کے بعد خاوند کو سنبھال کر رکھنے کا فکر۔"

"عورت کی زندگی کا مقصد" جب بڑا واضح ہو کر اچلا کی آنکھوں کے سامنے آیا تو اچلا کو نہ کسی بے تابی کا خیال آیا اور نہ کسی روک کا! ایک عجیب بیگانگی اچلا کے انگوں میں اتر گئی۔

اچلا اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اس طرح اٹھی، جیسے اس کے گھٹنوں میں اپنی ماں کے گھٹنوں کی طرح جوڑوں کا درد شروع ہو گیا ہو۔ اس کی ماں اسی طرح جب گوبھی اور شلجموں کا آچار ڈالتی گھنٹہ بھر ایک ہی جگہ پر بیٹھی رہتی تھی، تو پھر اس سے اٹھنا محال ہو جاتا تھا۔ اچلا جن دنوں سائکالوجی کا ایم۔اے کر رہی تھی، وہ فرائڈ کی کتابیں پڑھتی ماں کو ہنس ہنس کر اس کے خوابوں کے مطلب سمجھایا کرتی تھی۔ لیکن آج جب انگریزی اخباروں اور رسالوں کے صفحات پلٹتی اپنی ماں کی طرح اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے لگی، تو اس کو محسوس ہوا کہ فرائڈ کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ عورت کے گھٹنوں میں کس عمر میں اور کیوں کوئی درد جم کر بیٹھ جاتا ہے......

اچلا کا دل اس وقت کسی کام میں یا کتاب میں نہیں لگ سکتا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر ایک دفعہ زبان پھیری، اور پھر فریج میں سے پانی کا گلاس نکال کر پیا، اور پھر واپس اپنی بچی کے کمرے میں چلی گئی۔ بچی کھیلتے کھیلتے روئی کے گدے پر سو گئی تھی۔ لکڑی کی ممیری اس کے ہاتھ کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ ممیری اس وقت گھوم نہیں رہی تھی۔ عورت کی زندگی کا جو مقصد اس وقت بڑا واضح ہو کر اچلا کو دکھائی دیا تھا، محسوس ہوا کہ وہی مقصد اپنے ہاتھ سے اس کی ہر ایک سوچ کو ممیری کی طرح گھما رہا ہے......

"میں کون ہوں؟ جو کچھ بھی ہوں ایک بیوی کی شکل میں ہوں، اور میں ماں کی شکل میں ہوں----- نکمل کی ممی، نیرو کی ممی----" اور اگر اچلا کی ممیری کی طرح گھومتی سوچیں جب تھک کر کھڑی ہونے لگیں، تو اس کو محسوس ہوا کہ ان سوچوں کا کوئی مطلب نہیں۔ اگر زور زور سے یہ گھومتی رہیں تو بھی ان کا کوئی مطلب نہیں، کیونکہ انہوں نے چل کر کہیں نہیں پہنچنا ہوتا۔" اور اچلا کو معلوم ہو گیا کہ وہ کافی عرصے سے کیوں اداس ہے، "میں اپنے ذاتی وجود کے مطلب ڈھونڈ رہی ہوں...... لیکن ہر عورت نے یا خاوند کے ذریعے زندہ رہنا ہوتا ہے، یا بچے کے ذریعے۔ اس لئے اس کے ذاتی وجود کا کوئی مطلب نہیں ہوتا...... اس کے کسی نام کا بھی کوئی مطلب نہیں ہوتا، اس کے صرف دو ہی نام ہوتے ہیں----- ایک بیوی، ایک ماں۔ اور یہ دونوں نام کسی دوسرے کے وجود کا صدقہ ہوتے ہیں۔ خاوند ہو تو اس کے وجود کا صدقہ وہ بیوی ہو سکتی ہے، بچہ ہو، تو اس کے وجود کا صدقہ وہ

ماں ہو سکتی ہے.....“

سامنے روئی کے گدے پر نیرو بچی اپنے انگوٹھے کو اپنے منہ میں ڈال کر سوئی ہوئی تھی۔ اس کو اس وقت بہلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اچلا نے اپنے آپ کو بہلانے کے لیے لکڑی کو بھمیری کو گھمایا، اور بھمیری کے گھومنے سے اچلا کو محسوس ہوا کہ بات جہاں ہے وہیں کی وہیں ہے، لیکن عورت کی ساری نسل بھمیری کی طرح گھوم رہی ہے......

اور اس کو محسوس ہوا کہ ابھی دیکھتے دیکھتے وہ اپنی ماں کی جگہ ہو گئی ہے، اور اپنی ماں کی طرح اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کبھی اٹھتی، کبھی بیٹھتی اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اور اس کی بچی نیرو، اس کی جگہ...... اپنی ماں کی جگہ پر کھڑی ہو کر، اپنے ذاتی وجود کے مطلب تلاش کرتی اپنی ان آنکھوں کو مل رہی ہے، جن آنکھوں میں سوچوں کی ایک گہری سی دھند چھائی ہوئی ہے...... اور سامنے روئی کے گدے پر نیرو کی چھوٹی سی بچی اپنے انگوٹھے کو منہ میں ڈال کر سوئی ہوئی ہے......

کھچڑی

سورتی نے نانی سے سنا ہوا تھا' "کھچڑی بڑی کھچری ہوتی ہے' کبھی ساتھ دہی مانگتی ہے' کبھی پاپڑ' کبھی آم کا آچار....." کھچڑی کے پتیلے میں کڑچھی چلاتے سورتی نے آگ کی لاٹ جتنی آہ بھری' "چڑیا لائی چاول کا دانہ' کوا لایا مونگی کا دانہ' اسی کھچڑی کو بیاہ کہتے ہیں...... مگر میں نے تو ساتھ کچھ نہیں مانگا---- نہ زیور نہ کپڑے..... صرف سر کی چھت' اور ایک کونہ' جہاں مٹی کا چولہا جلا لوں....."

دل کے تھرکنے کی طرح چولہے کی آگ بھی تیز جل رہی تھی۔ سورتی نے دل کو بھی سنبھالا اور چولہے سے لکڑی بھی پیچھے کھینچی۔ اس کو پھر نانی کا کہنا یاد آیا' "کھچڑی تو ہلکی آنچ پر پکتی ہے' گاہن کر کے وہ کیسی کھچڑی' جو پک پک کر ملائی نہ ہو جائے۔" اور سورتی نے آگ کے دھوئیں جیسی آہ بھری' "میں تو سفید چاول کی طرح گل گئی' مگر وہ مونگی کے کنکر جیسا' گلنے میں ہی کتنی دیر' اس بیاہ کو گاہن کر کے کتنا.....؟" "نہیں آتا۔ دانہ ہوتا تو گل نہ جاتا؟ نانی جب بھی کھچڑی پکاتی تھی' چھوٹا دیسو ہمیشہ ہی منہ بسور لیتا تھا" "میں نہیں کھاتا' یہ بیماروں کا کھانا----" اور سورتی کی چھاتی میں تڑکتے کوئلے کی طرح ایک خیال آیا" "یہ بیاہ بھی تو بیماروں کے بیاہ جیسا ہے' کل کو میرے گھر پیدا ہونے والا بچہ شاید دیسو کی طرح کہے گا---- میں نہیں ہنستا' بیماروں کے صحن میں......

"یہ کھچڑی بیاہ۔ بیماروں کے کھانے جیسا....." سورتی کو بالکل پہلا دن یاد آیا' جب وہ چوکی چڑھی تھی...... سہیلیوں سے سنا ہوا تھا کہ نئی بیاہتا لڑکی جب چوکی چڑھتی ہے' اس کی ساس اس کے شگن کرتی ہے---- پہلے دن اس کے ہاتھوں کیسر والا حلوہ بنواتی ہے' گریوں' میووں اور کیسر والا حلوہ' اور گلی محلے والے بھی اس سے لاڈ چاؤ کرتے ہیں۔ مگر لاڈ چاؤ والی کہانیاں تو دل بہلانے کے لئے ہوتی ہیں' کوئی استعمال کرنے کے لئے تھوڑا ہی ہوتی ہیں......

وہ تو بالکل تنہا اسی شہر میں اس کے پاس آگئی تھی' جس کے ساتھ اس نے دو ماہ پہلے پھیرے لئے تھے۔ دو ماہ وہ میکے بیٹھی انتظار کرتی رہی تھی کہ شہر میں رہنے کے لئے جب گھر ملے گا' اس کا خاوند اس کو لے جائے گا۔ اس کا خاوند جو دفتر میں ملازمت کرتا تھا' اسی دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ اسی دفتر کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ جب تک کنوارہ تھا' اس کو کبھی شہر میں گھر تلاش کرنے کا خیال نہیں آیا تھا اور پھر اس کی ٹانگیں تھک گئی تھیں---- اس کو شہر میں گھر نہیں ملا تھا۔

اور سورتی دو مہینے انتظار کر کے خود ہی گاڑی پر سوار ہو گئی تھی۔ جان پہچان کے ایک تائے کے پاس رہ کر اس نے شہر میں ایک گھر تلاش کیا تھا---- خوبصورت خوبصورت گھر اس کا منہ چڑاتے رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی اس کی جیب پھٹ سی گئی محسوس ہوتی تھی' اور جو گھر سستے تھے' وہ یوں تھے---- جیسے ٹوٹی ہوئی ڈبیوں اور بوتلوں کی طرح وہ کسی نے گندگی پر پھینک دیئے ہوں۔ لیکن سورتی کی ٹانگیں تھکی نہیں تھیں۔ اس نے گلی گلی گھوم کر ایک سرکاری بستی میں آدھا گھر تلاش کر لیا تھا۔ سرکار کی طرف سے جن کو گھر ملتے ہیں' سستے' بالکل معمولی کرائے پر' کئی ان میں سے آدھے گھر میں ہی گزارہ کر لیتے ہیں' اور آدھا گھر بغیر رسید کے کرائے پر چڑھا دیتے ہیں۔ سورتی نے اس طرح کا ہی ایک آدھا گھر تلاش کر لیا تھا۔ اور پھر چوکی چڑھنے والے شگنوں کی جگہ وہ جھاڑو لے کر چولہا چوکا دھونے لگ گئی تھی......

"آج کیا پکاؤں؟" اس نے اپنے مرد سے چاؤ سے پوچھا تھا۔ پہلا دن تھا...... اپنے شگن اس نے خود ہی کرنے تھے......

"سبزی خریدنے کے لئے اب بازار جانا پڑے گا' دال چاول پڑے ہیں' کھچڑی بنا لو' میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں......" اس کے خاوند نے کہا تھا' اور وہ ملائی کھچڑی پکانے کے لئے دال چننے لگ گئی تھی۔

پھر اگلے دن بھی کھچڑی...... اگلے دن بھی...... اور آئے دن کھچڑی---- اس کے خاوند کی معلوم نہیں کس طرح کی اکھڑی اکھڑی صحت تھی...... بھنی ہوئی یا تلی ہوئی چیز اگر کبھی کھلا دیتی' وہ اور بھی سست سا ہو کر چارپائی پر پڑا رہتا۔ لیکن اگر صرف کبھی اتنی وہ بات ہوتی...... سورتی کے دانتوں میں جیسے ملائی جیسی کھچڑی کھاتے کنکر آگئے ہوں---- ایک دن

وہ کھڑکی کے قریب دالان میں کھڑی دال چن رہی تھی' کہ سورتی کے ہاتھوں میں پکڑے دال کے سارے دانے کوڑ کو بن گئے..... ان کی باتوں میں شعروشاعری بھی تھی---- لیکن اس کے خاوند کی حسرتیں بھی---- ایک بنگالی لڑکی..... جس کے منہ بغیر شوق مر گئے تھے..... بھوکے بیراگی راہ کراب کھائے بھی کچھ نہیں کھایا جاتا' کچھ ہضم ہی نہیں ہوتا تھا..... اور جسم کی آگ کو بھی وہ یونہی..... زبردستی جلا رہا تھا.....

سورتی اس لمحے بجھی ہوئی لکڑی کی طرح ہو گئی تھی.....

اور پھر بجھی آگ کو جیسے کوئی پھونکیں مارتا ہے---- سورتی نے اس رات جوڑے میں بندھے ہوئے اپنے لمبے بال کھول کر' بنگالنوں کی طرح کندھوں پر ڈال لئے تھے' کھلے بالوں میں پھول ٹانکا تھا' اور بنگالنوں کی طرح ہی اس نے دوڑی کنی کی ایک سادہ سی دھوتی باندھی تھی' ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگایا تھا..... اور پھر اپنا بدن ایک بیگانے انداز میں لپیٹ کر اس نے اپنے خاوند کو دے دیا تھا.....

لیکن یہ بھی ادھار لی ہوئی آگ تھی' تھوڑا سا اس کے خاوند کی آنکھوں میں روشنی بولی---- پھر وہی خاموشی اور وہی اندھیرا.....

دن گزرتے گئے' بجھی آگ پر چاولوں کے دانے الگ تیرتے رہے' دال کے دانے الگ.....

"چڑیا لائی چاول کا دانہ..... سورتی نے کوکھ میں پلتے اپنے بچے کی طرف توجہ کی' اور غرور سی گئی کہ اس کی بغیر نمک کی کھچڑی میں آخر خدا نے نمک کی چٹکی ڈال دی ہے---- مگر ساتھ ہی سرد چولہے کی طرح اس کا دل بجھ گیا' کہ چولہے کی آگ بغیر نہ چاولوں نے دال میں ملنا ہے' اور نہ دال نے چاولوں میں.....

چولہے کی آگ تو عرصے سے بجھ گئی ہوئی تھی.....

ڈم لائیٹ

"دو کاریں جب مخالف سمتوں سے آ رہی ہو' قانون کے مطابق دونوں کو اپنی اپنی لائیٹ ڈم کرنی چاہئے' لیکن اگر وہ دونوں ہی قانون بھول جائیں تو وہ ایک دوسری کی روشنی میں اتنا چندھیا جاتی ہیں کہ وہ ایک دوسری کے قریب سے گزرنے کی بجائے' آپس میں ٹکرا جاتی ہیں......" رابن نے سوچا' اور مسکرا پڑا' "کئی شادیاں بالکل اس حادثے کی طرح ہوتی ہیں-----" اور رابن کو محسوس ہوا کہ اس کی اور آئیرہ کی شادی ایک دوسرے کو جان کر اور پہچان کر ہوئی شادی نہیں' صرف ایک دو ملاقاتوں کی چمک سے گھبرا کر ہوئی شادی ہے...... یہ سب کچھ وہ اس وقت سوچتا تھا' جب آئیرہ اس کے پاس نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب پاس ہوتی تھی' وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ آئیرہ میں جو چمک اس نے پہلے دیکھی تھی' وہ آج بھی قائم تھی۔ اور وہ جب سامنے آتی تھی' وہ کچھ نہیں کہتا تھا' صرف آنکھیں جھپکا لیتا تھا۔

یہ چمک آرہ کے انگوں میں تھی۔ انگوں والی چمک کو اس نے "سیکس اپٹریکشن" اور پھر "سیکس ایڈجسٹمنٹ" کہہ کر کسی طرح سمجھ لیا تھا' لیکن آئیر کے مزاج والی چمک اس کے لئے ابھی بھی ایک مشکل حالت تھی-----۔ آنکھوں کی تھکاوٹ کی طرح اور آنکھوں میں اچانک اٹھتی ایک ٹیس کی طرح۔

اور وہ سوچتا تھا کہ شائد یہی حالت آئیرہ کی تھی۔ وہ جب اس کے پاس ہوتی تھی' آئیرہ کو اس کے وجود میں دنیا کا سب کچھ بھول گیا محسوس ہوتا تھا-----۔ آئیرہ کی آنکھوں میں رابن دنیا کا سب سے حسین مرد تھا-----۔ اور اس لئے وہ بھی شائد رابن کی چمک میں آنکھیں جھپک کر رہ جاتی تھی۔ لیکن جب وہ اکیلی ہوتی تھی' رابن جانتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کو اور ہر واقعے کو وہ رابن کے وجود سے دور ہو کر دیکھتی ہے' اکیلی اور ایک عجیب زاویے سے!

یہ زاویے ان دونوں کے کبھی بھی ایک نہیں ہوئے تھے۔ رابن ڈاکٹر تھا' مریضوں کی

نبض پر جب ہاتھ رکھتا' یا ان کی چھاتی پر سٹیتھو سکوپ' تو اس کو مریضوں کی جیب میں یا بنک میں پڑے ہوئے پیسوں کا خیال کبھی نہیں بھولتا تھا۔ لیکن وہ جتنے بھی پیسے محبت سے جوڑتا تھا' آئیرہ ان پیسوں کو واپس مریضوں تک پہنچانے کے لئے جیسے بے تاب رہا کرتی تھی۔۔۔۔۔ جب دیکھو کسی کو پھل کھلا رہی ہوتی تھی' کسی کو مفت وٹامنز کی گولیاں دے رہی ہوتی تھی......

"یہ سائیری وائیری ایک بیماری ہوتی ہے......" رابن نے کئی دفعہ آئیرہ کو کہنا چاہا' لیکن اس کو محسوس ہوتا کہ آئیرہ کو بیماروں اور بیماریوں کے ساتھ ایک عشق ہے۔ ٹوٹے ہوئے بوٹوں والے اور گردن میں لٹکتے بالوں والے لوگ معلوم نہیں وہ کہاں سے ڈھونڈ لاتی ہے' جھومتی ہوئی آنکھوں سے وہ ان کی اوٹ پٹانگ سنتی رہتی تھی' اور فرش پر بکھرے ہوئے ان کے سگریٹوں کے ٹکڑے چنتی۔ وہ اپنی موٹر میں کبھی ان کو لینے جا رہی ہوتی ہے' کبھی چھوڑنے جا رہی ہوتی ہے......

"میری دشمن!" رابن نے ایک دو دفعہ آئیرہ کو تڑک کر کہا تھا۔ لیکن آئیرہ نے کچھ بھی سننے یا سمجھنے کی بجائے ہونٹوں میں ایک مسکراہٹ کی چمک بھر کر کہہ دیا تھا' "تمہاری جان کی نہیں' تیرے ایمان کی دشمن"۔۔۔۔۔ رابن کو معلوم تھا کہ آئیرہ پیسے کو رابن کا ایمان کہا کرتی تھی۔

ویسے پیسہ' رابن اور آئیرہ کی کسی بھی نااتفاقی کی بنیاد نہیں تھا۔ کبھی اس کا ذکر آتا تھا تو بڑا سطحی۔ اس سے گہری باتیں اور تھیں۔۔۔۔ مثلاً گزشتہ دنوں کے مشترکہ دوست راہل اور ریتا نے' جو گزشتہ پانچ برسوں سے لندن میں تھے' اپنے دونوں بچے ریتا کے ماں باپ کے پاس بھیج دیئے تھے' تو آئیرہ کو کتنے دن فکر سے نیند نہیں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ راہل اور ریتا کی شادی ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے راتیں جاگ جاگ کر کئی وہ چھوٹی باتیں سوچی تھیں' جو ریتا نے گزشتہ برس اس کو خطوط میں لکھی تھیں' "راہل نہیں چاہتا تھا' لیکن میں ایک انگریز لڑکی کے ساتھ پندرہ دنوں کے لئے پیرس چلی گئی...... راہل ایک ٹریننگ کے سلسلے میں شہر سے بہت دور ہے' میں آج کل لندن میں اکیلی رہ رہی ہوں...... میں آج کل پینٹنگ سیکھ رہی ہوں۔ ہمارا ایک پروفیسر بڑا دلچسپ آدمی ہے......" اور ان چھوٹی باتوں میں سے آئیرہ نے بہت بڑی

باتیں دیکھ لی تھیں۔ اور پھر وہ اتنا گھبرا گئی تھی کہ اس نے بمبئی میں رہتے راہل اور ریتا کے رشتے داروں کو بھی یہ بات سنا دی تھی۔ بات کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھی۔۔۔۔۔ اس کو پر آئیرہ نے دیئے تھے۔ رابن جانتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن جب یہ بات بالکل بے بنیاد ثابت ہوئی تھی' تو شرم سے رابن کو آئیرہ پر بہت غصہ آیا تھا......

اور پھر کچھ دن پہلے جب رابن کے ایک بھائی اور ایک بہن ان کے پاس رہنے کے لئے آئے' آئیرہ نے ان کی بڑی تواضع کی۔ وہ بڑے خوش تھے۔ سارا دن وہ بمبئی کے دور نزدیک سمندر کے ساحل پر گھومتے' اور رات کو فلمیں دیکھتے تھے۔ وہ اپنے اپنے کالج کے آخری امتحان دے کر آئے تھے' اور زندگی کی فرصت کو چکھ کر دیکھ رہے تھے۔ لیکن ایک رات۔۔۔۔ جب وہ دونوں بہن بھائی ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ آئیرہ آدھی رات کو ایک جاسوس کی طرح ان کے کمرے میں گئی تھی' اور ان کو دیکھ آئی تھی کہ کہیں...... کہیں ان دونوں سے کوئی غلطی نہ ہو جائے..... رابن کو آئیرہ کا یہ خوف صرف بے بنیاد محسوس نہیں ہوا تھا' بلکہ غلیظ بھی۔

اور پھر تھوڑا عرصہ پہلے ان کے ایک رشتے دار کی شادی تھی۔ وہاں جا کر آئیرہ نے ان کے گھر کا اتنا کام سنبھالا کہ پرائے گھر کے ایک ایک فرد کو اس نے موہ لیا۔ لیکن بیاہی آئی لڑکی کو وہ ہنساتی کھلاتی' ایک دن آہستہ سے اس کے پاس بیٹھ کر اس سے پوچھنے لگی کہ اس نے شادی سے پہلے کسی اور کو پیار کیا تھا کہ نہیں۔ لڑکی رونے لگی تھی' آئیرہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کو وہ کس طرح چپ کرائے۔ رابن کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ آئیرہ پر بہت برسا تھا......

"تمہارے سات خون معاف۔" رابن آئیرہ کی لمبی اور کالی پلکوں میں چمکتی پریشان آنکھوں میں دیکھتا تھا' اور پھر سوچوں میں ڈوب جاتا تھا۔

"لیکن آٹھویں خون کا کیا ہو گا؟ تم وہ مجھ کو معاف نہیں کرو گے؟" آئیرہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی تھی' اور رابن کے گلے میں پڑا ہوا اس کا نرم سا بازو' بے بس ہو کر' لوہے کے تار کی طرح اس کے گرد کس جاتا تھا۔

"نہیں آٹھواں خون معاف نہیں کروں گا۔" رابن آئیرہ کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں

چرا کر کہتا تھا۔

رابن کے بڑے بھائی نے بہت عرصہ ہوا اس سے کچھ روپیہ ادھار لیا تھا' اور دو مہینے میں واپس کرنے کا اقرار کیا تھا' لیکن برسوں گزر گئے تھے' اس نے واپس نہیں کیا تھا۔ اور رابن نے اپنے بھائی کو ملنا چھوڑ دیا تھا۔ ماں ابھی زندہ تھی' اور اس کے دل پر اس بات کا بڑا بوجھ تھا۔ اور پھر آئیرہ نے رابن کی زندگی میں آتے ہی ماں کے دل سے یہ بوجھ اتار دیا تھا۔ بڑے بھائی کو آئیرہ نے یقین دلایا تھا کہ رابن اب اس بات کو بھلانا چاہتا تھا' لیکن برسوں کی خاموشی توڑنا اس کے لئے بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ اور آئیرہ نے رابن کے بڑے بھائی کو منت سے کہا تھا کہ اگر وہ فراخدل ہو کر رابن کو ملنے کے لئے آجائے' تو رابن اپنے دل میں بڑا خوش ہو گا۔ اور آئیرہ نے رابن کو وہ پوری رقم دے کر کہا تھا' کہ یہ رقم اس کے بھائی نے واپس کی ہے۔ اپنے ہاتھوں اس لئے واپس نہیں کی' کہ اس کو اتنی دیر سے واپس کرتے شرم آتی تھی۔ اور اس کے بعد جب وہ دونوں بھائی ملے تو دونوں ایک دوسرے کو خاموش عزت سے ملے۔ ماں کو کچھ علم نہیں تھا' لیکن وہ آئیرہ کے جادو پر قربان ہو گئی۔ چاہے بہت دیر کے بعد آئیرہ کے جادو کا جب رابن کو علم ہوا' وہ کچھ آئیرہ سے ناراض بھی ہو گیا' لیکن پھر بھی کہیں اندر سے آئیرہ کے جادو سے چندھیا گیا تھا۔ یہ چمکیں رابن کو اچھی لگتی تھیں' لیکن ان کی آنکھوں میں پڑتی روشنی سے ہوئی گھبراہٹ اس کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس کا دل کرتا تھا' کہ آنکھوں میں پڑتی اس "فل لائیٹ" کی جگہ اگر کبھی آئیرہ اپنی روشنی کو تھوڑا سا "ڈِم" کر لے...... دونوں کہاں اور کس جگہ پر کھڑے تھے' رابن کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ آئیرہ کس لمحے کسی کو کیا کہہ دے گی' یہ "کیا" یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اردگرد کے لوگ "ایڈمائریشن" میں آئیرہ کو دیکھتے رہ جائیں' اور یہ "کیا" یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لوگ کسی "ایمبیرسنگ" کے سوال سے بچنے کے لئے اپنی آنکھیں چرانے لگیں......

گزشتہ چند دنوں سے آئیرہ جب غسل خانے جاتی تھی' اپنے ڈیڑھ برس کے بیٹے کو بھی نہلانے کے لئے اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ آئیرے کے چہرے کو عام طور سے ایک بڑا خوش اور کھلا ہوا چہرہ کہا جا سکتا تھا۔ لیکن رابن نے دیکھا کہ آئیرہ جب بچے کو نہلا کر بڑے تولیے میں لپیٹ کر اپنے گیلے بازوؤں میں دبائے غسل خانے سے باہر آتی ہے' اس کا چہرہ پہلی روشنی

کی طرح جگمگاتا محسوس ہوتا ہے...... اور ایک دن آئیرہ نے بڑی مخمور آنکھوں سے رابن کی طرف دیکھا' اور کہنے لگی ''راب! تم اندازہ نہیں لگا سکتے جب میں اس چھوٹے سے بچے کو چھاتی پر لٹا کر ٹب میں پڑی رہتی ہوں' تو یہ اپنے ہونٹوں سے اور ناخنوں سے جس طرح میری گردن اور چھاتی کو کھرچتا ہے' میرے بدن پر جس طرح یہ ٹانگوں سے دولتیاں مارتا ہے۔۔۔۔ اٹ از سمپل ونڈر فل...... پیور ایکسٹیسی......'' اور آئیرہ نے اڑ کر بچے کے گیلے بالوں میں سے یہ لمبا سانس بھرا تھا۔۔۔۔۔ سانس کا گھونٹ سا پیا تھا۔ پھر کہنے لگی تھی ''خدا جیسی پاک چیز صرف یہ' یہ بچہ ہو سکتا ہے۔''

''اٹ از پرورشن۔'' رابن نے آہستہ سے کہا' اور دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔

لیکن آج رات رابن جب آئیرہ کے پاس سویا پڑا تھا' آئیرہ نے رابن کے پاس سے اپنے ہونٹ دور کر لئے' اور کہنے لگی ''یوں نہیں راب! یہاں بند کمرے میں اور اندھیرے میں چوروں کی طرح نہیں۔۔۔۔۔ کہیں باہر کھلے آسمان تلے جہاں چاند کی پوری روشنی پڑ رہی ہو۔۔۔۔ اور یا سفید دن نکلا ہو۔۔۔۔'' آئی وانٹ اٹ دیئر' دین دی اوپن......''

''آئیرہ!'' رابن گھبرا گیا۔ پھر بہت دیر خاموش رہا' اور پھر اس نے آئیرہ کے کندھے پر ایک سخت سا ہاتھ رکھ کر کہا ''میں نے کبھی تم کو کہا نہیں' لیکن کئی بار سوچتا ہوں' کہ دو کاریں جب مخالف سمتوں سے آ رہی ہوں' دونوں کو اپنی اپنی روشنیاں ڈم کرنی چاہئیں' نہیں تو ایک دوسری کی روشنی دونوں پر اتنی پڑ جاتی ہے' کہ دونوں کو راستہ نظر نہیں آتا۔ میں راستہ دیکھنا چاہتا ہوں آئیرہ! تم اپنی لائیٹ کچھ ڈم کیوں نہیں کرتی؟''

''کیا مطلب؟'' آئیرہ کے ہونٹ ہنس کر خشک سے ہو گئے۔

''جو کچھ بھی تمہارے دل میں ہے' تم کسی دن مجھے بتا کیوں نہیں دیتی؟..... شائد اسی لئے تم کمرے کا اندھیرا نہیں اس کھلے آسمان کی روشنی چاہتی ہو......''

''اس کے ساتھ کچھ بتانے کا یا نہ بتانے کا کیا سوال؟''

''سورج کی روشنی میں چاند کی چاندنی میں اپنی ننگا بدن میرے حوالے کر کے۔''

''تمہارا خیال ہے راب! کہ اس طرح میں......'' آئیرہ کی آواز ہلکی سی کانپ گئی' لیکن اس نے آواز پھر سخت کی اور کہا ''اس طرح میں ڈائریکلی نہیں بتا رہی ہوں گی؟''

"ہاں' مگر وائی ناٹ ڈائیر یکٹلی آئرہ؟"

کمرے کی نیلی روشنی میں رابن نے دیکھا کہ آئرہ کے دودھیا گلابی بدن سے جیسے کسی نے خون کا رنگ کھینچ لیا ہے' اور بدن لمحہ بہ لمحہ گرد کے رنگ جیسا ہوتا جا رہا ہے۔

آئرہ کے ہونٹ آہستہ سے ہلے' "راب! تم اسی حالت کو لائیٹ کا ڈم کرنا کہتے ہو!"

رابن نے کچھ نہیں کہا۔ آئرہ نے ہی پھر کہا' "تم ٹھیک کہتے ہو راب' میں نے زندگی کو دو طرح ہی دیکھنے کا طریقہ سیکھا ہے۔۔۔ بتی کو لٹ لٹ جلا کر' یا بالکل بجھا کر۔ چھوٹی ہوتی تھی' اپنی بتی کو جلانے کا طریقہ نہیں آتا تھا' سامنے اگر کوئی نظر آتا تھا' گیس کی طرح جلتا نظر آتا تھا' گیس کی طرح بھی نہیں' بھانبڑ کی طرح جلتا۔ میرے اپنے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا' میں اس سے ہی روشنی ادھار لے کر اس کو دیکھ لیتی تھی...... آئیرہ کا چہرہ ایک سفید سی اور بھوری سی راکھ جیسا ہو گیا۔ رابن کے دل میں ایک مٹھی سی بھر گئی' اور اس کو پہلی دفعہ یہ خیال آیا کہ جس طرح وہ برسوں سے آئرہ کو بھری پوری روشنی میں دیکھتا آ رہا ہے' آئندہ بھی ویسے ہی دیکھتا رہتا' تو کیا حرج تھا...... ٹمٹماتی روشنی میں کسی نے گھور کر دیکھنا' اور اپنی آنکھوں کو اس کے دور اندر تک چبھو دینا کیا بہت ضروری ہے؟...... اور رابن نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو آہستہ سے آئرہ کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

آئرہ نے ہونٹوں پر پڑی ہوئی ہتھیلی کو آہستہ سے سونگھا۔۔۔۔۔ ہتھیلی کو نہیں' ہتھیلی میں آئی ہلکی سی کپکپاہٹ کو۔ اور پھر اپنے ہونٹوں کو اس کی ہتھیلی کے نیچے سے سرکا کر کہنے لگی' "اپنے کو بالکل بجھا کر دیکھا تھا۔ اس سے پھر اس طرح ڈر گئی تھی' کہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو اچھی طرح روشن کر کے جلا کر رکھنے کی عادت ڈال لی۔"

رابن کو محسوس ہوا کہ وہ جلدی سے کچھ کہہ دے' ورنہ یہ موقع ضائع ہو جائے گا۔ اور پھر شائد وہ اس ضائع شدہ موقعے کو کبھی واپس نہیں لا سکے گا۔ کہا' "آئرہ! تم نے جس طرح بھی اپنے آپ کو جلایا ہوا ہے' یہ بہت ٹھیک ہے' بہت اچھا' میں تم میں کچھ بھی تبدیل کرنا نہیں چاہتا......"

رابن کو محسوس ہو رہا تھا کہ ٹمٹماتی روشنی میں اگر کسی کو اپنا آپ دکھانا مشکل ہوتا ہے' تو کسی کے لئے اس کو دیکھنا بھی اتنا ہی مشکل ہو سکتا ہے۔ "نہیں راب! میں اس لائیٹ کو

اچھی واقعی ڈم کرنا چاہتی ہوں، میں نے اس کو اس لئے تیز جلایا ہوا تھا' کہ میرے سب کچھ کو کبھی بھی کوئی نہ دیکھ سکے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہو گیا ہے' کہ صرف دوسرے ہی مجھ سے آنکھ نہیں چراتے' میں خود بھی اپنے سے آنکھ چرانے لگ گئی ہوں...... جب بہت چھوٹی تھی' سکول میں پڑھتی تھی.... سکول کے بڑے ماسٹرجی......" آئرہ کی ٹانگیں اکٹھی ہو کر اس کے بازوؤں میں سکڑ گئیں' اور اس کے ہاتھ کی ہتھیلیاں اکٹھی ہو کر اس کے چہرے پر آگئیں...... گزرے ہوئے وقت کے بہت بڑے اور کالے پر جیسے آئرہ پر جھپٹ پڑے' اور شائد ماسٹرجی کا نرم اور چوڑی ہڈیوں والا ایک پھیلا ہوا وجود بھی آئرہ کے ننگے جسم پر جھک گیا......

رابن نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں' مگر محسوس ہوا' وہ بند آنکھوں سے آئرہ کو ٹٹول رہا ہے' اور وہ جہاں بھی' دیوار سے' سمٹی ہوئی اور ایک زخمی کبوتری کی طرح اپنے پروں میں سمٹی ہوئی ہے اس کو ڈھونڈ رہا ہے' اور ڈھونڈ کر اپنی چھاتی سے لگا رہا ہے......

"میرے سات خون معاف تھے' لیکن یہ تو آٹھواں خون ہے......" آئرہ کے ہونٹ سسک سے گئے۔

"تمہارے سب خون معاف......" رابن نے آئرہ کے ہونٹ چوم لئے' اور اس کو محسوس ہوا کہ آئرہ کے پورے ہونٹ آج اس نے پہلی دفعہ چومے ہیں......

مونالیزا نمبر۲

پچھلے کچھ برس میں میں نے جو کچھ دیکھا' سنا اور جانا ہے' اگر اسے کچھ ترتیب سے آپ کے سامنے رکھوں تو ایک طرف کچھ نظمیں رکھ سکتا ہوں۔۔ یعنی کہ انسان کے کچھ سپنے جن کے ہر پنکھ میں کئی رنگ ہوتے ہیں۔۔۔ اور دوسری طرف قتل کی انسائیکلوپیڈیا۔۔ یعنی انسان کے وہ فعل جن کے ہر پنکھ میں صرف خون کا ایک ہی رنگ رچا ہوتا ہے۔

اور ان دونوں کے بیچ میں مونالیزا کو رکھ سکتا ہوں۔ مونالیزا نمبر۲ کو۔

میری اس کی جان پہچان کے پہلے روز اس نے اپنا یہ نام رکھا تھا کہنے لگی "ویرجی' کوئی نام بتاؤ مجھے اپنا نام رکھنا ہے۔"

"ابھی تک تیرا کوئی نام ہی نہیں؟ ہوگا ہی نہیں' اسی لئے ابھی تک تو نے اپنا نام مجھے نہیں بتایا۔"

"میرا نام "س" سے شروع ہوتا ہے' مگر میں چاہتی ہوں' میرا نام ایسا ہو جو "ش" سے لے کر "م" تک کے حروف میں کسی سے شروع ہو۔"

"تیرے خیال کے مطابق "س" سے پہلے جو حروف آتے ہیں' کیا وہ اچھے حروف نہیں ہوتے؟"

"پتہ نہیں' مگر میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا کے خاص لوگوں کے نام "ش" سے لے کر "م" تک کے حروف والے ہوتے ہیں۔"

"یہ تو نے کہاں پڑھا تھا؟"

"یاد نہیں' مگر میں نے پڑھا ضرور تھا۔"

میں نے کہا کچھ نہیں' صرف غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چھوٹا سا قد' خوبصورت بھرا بھرا جسم' گورا رنگ' مگر گال جیسے گورے رنگ سے ابھرے ہوئے تھے اور اسی ابھارے کی وجہ

سے ہونٹ کچھ لٹکے ہوئے تھے۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس برس کی ہوگی مگر اس کی عمر کسی کو اپنی طرف کھینچتی سی نہیں لگتی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر نہیں تھیں' وہ تو میرے کمرے میں لگی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تصویر کس کی ہے؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"اتنی مشہور تصویر تو نے پہلے کبھی نہیں دیکھی؟ یہ دنیا کی اس عورت کی تصویر ہے' جس کی مسکراہٹ کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔"

"کیا مطلب؟"

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی مسکراہٹ میں اداسی بھی شامل ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ اداسی یا مایوسی بالکل نہیں' اس میں صرف جوانی کی تپش ملی ہوئی ہے' یا شاید دنیا پر کوئی طنز۔ اس کی معصوم رازدانہ مسکراہٹ پر بحث کرتے ہوئے دنیا کو نہ جانے کتنی صدیاں بیت چکی ہیں۔ بہر حال اس کی مسکراہٹ کا مطلب چاہے کچھ بھی ہو' مگر یہ ضرور ہے کہ اس کی مسکراہٹ نے دنیا کے لاکھوں آدمیوں کا دھیان اپنی طرف کھینچے رکھا تھا اور اب بھی کھینچے ہوئے ہے۔"

"اس کا نام کیا تھا؟"

"مونالیزا"

"مونالیزا۔۔۔ میم سے! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بھی اپنا نام مونالیزا ہی رکھوں گی۔"

"مونالیزا؟" میں اسطرح چونک پڑا' جیسے اس لڑکی نے میرے دیکھتے دیکھتے میری دیوار پر لگی ہوئی مونالیزا کی تصویر پھاڑ دی ہو۔۔۔ نہیں' میری دیوار پر لگی ہوئی ایک معمولی تصویر نہیں' مونا لیزا کی اصلی یونارڈو ڈاونچی کی پینٹ کی ہوئی کینوس پھاڑ دی ہو۔

"کیا جو کچھ اپنے پاس نہیں ہے' وہ خریدا نہیں جا سکتا؟" وہ ہنس پڑی۔ میرا مطلب ہے' تو وہ مسکراہٹ خرید سکتی ہے؟"

"ہاں خرید سکتی ہوں۔" اس نے کہا اور پھر ہنس دی۔ وہ یا تو چپ رہتی تھی یا ہنستی تھی' چپ رہتی تو اس کے موٹے ہونٹ اس کے منہ پر لگے ہوئے تالے کی طرح لگتے تھے۔ ہنستی تھی تو اس کے چوڑے دہانے میں سے اس کی ہنسی چوپٹ کھلتے دروازوں میں سے یکبارگی بہتی ہوئی لگتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی مسکراہٹ کو خریدنے والی بات مان بھی لے' تو اس مسکراہٹ کو وہ کن

ہونٹوں پر دُکھے گی؟ مگر میں اس سے کوئی دل دکھانے والی بات نہیں کہہ سکتا تھا' وہ میری آج ہی شناسا بنی تھی اور وہ بھی بڑی مہربان کے روپ میں۔ وہ میرے پاس میری اس کاشنی کا پیغام لے کر آئی تھی' جس کا پیغام تو کیا نام سننے کے لئے بھی میرے کان برسوں سے ترس رہے تھے۔ کئی سال ہوئے کاشنی کے بیاہ کی رات کو اس کا خط آیا تھا کہ اگر میں اسے بھول سکوں تو بھول جاؤں۔ اس کے بعد کاشنی نے کبھی نہیں پوچھا کہ "اگر" کا لفظ استعمال کرتے وقت اس نے اپنی جس یاد کو بھولنے یا نہ بھولنے کے درمیان لٹکا دیا تھا' اس کا کیا بنا؟ اور اب یہ لڑکی مجھے بتا رہی تھی کہ وہ جس اسکول میں پڑھاتی ہے' آج کاشنی اسی اسکول میں اپنی بچی کو داخل کرانے آئی تھی اور پھر پتہ نہیں کیسے باتوں کے ذخیرے میں سے اس نے یہ بات کرید نکالی کہ اس کی بچی کی ماسٹرنی بھی اس بستی میں رہتی ہے' جہاں میں رہتا ہوں۔۔۔ اس کے کنوارے دنوں کا عشق۔

اس قاصد لڑکی نے مجھے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ سڑک پر گزرتے شاید کبھی دیکھا ہوگا' مگر میرے ساتھ بات کر کے اس نے آج پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔۔۔ اور اس کے کہنے کے مطابق آج کاشنی کو بھی اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے بات کرنے میں عجیب بے باکی تھی۔ ابھی جب اس نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور میں حیران سا ہوتا ہوا اسے پوچھنے لگا تھا کہ تم کون ہو' تو کمرے میں گزرتے ہوئے اس نے عجیب بے باکی سے کہا تھا "مجھے آپ کی سالی بننا تھا' مگر نہیں بن سکی' لہٰذا اب کچھ بھی نہیں۔" ایک ہی فقرے میں اس نے مجھ سے بہن یا سہیلی کا رشتہ بھی جوڑ لیا تھا اور میرے ساتھ کاشنی کی شادی کا امکان بھی۔ "مگر تو نے مجھے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔" وہ جانے لگی تھی جب میں نے اس سے یہ بات پوچھی۔

مونا لیزا۔۔۔ ابھی آپ کے سامنے میں نے اپنا نام رکھا ہے آپ مونا کہہ کر بلایئے۔ ویسے میں پہلی مرتبہ میں یہ نام آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں' کیونکہ آپ کے گھر ہی یہ نام ملا ہے۔"

مجھے اس کے نام میں دلچسپی نہیں تھی' میں صرف اس کے منہ سے کاشنی کی باتیں ایک دفعہ سننا چاہتا تھا' اس لئے میں نے کہا "مونا! تو نے مجھے یہ جو کاشنی کا پیغام دیا ہے اسے پیغام کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔"

"پیغام صرف لفظوں میں ہوتا ہے؟ آنسوؤں میں نہیں ہو سکتا؟ آپ کا نام لیتے ہوئے میری آنکھیں پرنم ہو گئیں تھیں' ان آنکھوں کا پانی آپ کو کوئی پیغام نہیں معلوم ہوتا؟"

"مگر اس نے تجھ سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تو میرے پاس آئے اور یہ بات مجھے بتائے۔"

"پھر وہی بات' صرف لفظوں میں ہی کچھ کہا جا سکتا ہے؟"

مجھے یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں کاشنی کو پھر اسی شدت سے چاہنے لگوں گا جیسے کیا کرتا تھا' لیکن میں پریشان ضرور ہو گیا تھا اور میں نے دیکھا کہ مونا غور سے میرے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے پاس ایک چھوٹا سا بل بھی پڑ گیا تھا۔ وہ شاید ہم دونوں کی ان کہی باتوں کو سمجھ لینے کی اور پھر ایک دوسرے کے پاس جا کر کہہ سکنے والی سمجھ کی مسکراہٹ تھی۔۔۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ ابھی یہ مونالیزا کی مسکراہٹ کو خریدنے والی جو بات کہہ رہی تھی' اس کے بھید کا مجھے پتہ چل گیا ہے۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

اس رات میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک نظم لکھی۔ کاشنی مجھے اس طرح یاد آ رہی تھی' بلکہ یاد نہیں آئی تھی' میری نامراد چھاتی میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی تھی کہ کاش میری یہ نظم مونالیزا کاشنی کو پڑھوا دے.... تمہارا ذکر سن کر اگر کسی کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں' اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی تک کسی کے دل میں جیتے ہو۔ پتہ نہیں انسان اپنے جیتے ہونے کا یہ ثبوت کیوں مانگتا ہے' جیسے اپنے آپ میں زندہ ہونا کافی نہیں ہوتا.... میں تصور کو آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ کاشنی نے میری یہ نظم پڑھی ہے اور یہ نظم ایک جلتے کوئلے کی طرح اس کے دل میں پڑ گئی ہے اور اس کوئلے کی آگ سے اس کے دل میں پڑے ہوئے برسوں کے بجھے ہوئے کوئلے پھر سلگ پڑے ہیں.... ویسے مونا کے اسکول میں جا کر اسے ڈھونڈنا' یہ بات کہنا بھی پاگل پن لگ رہا تھا۔

میں مونا کے اسکول نہیں گیا۔ تین روز گزر گئے چوتھے روز مونا آئی۔ میں ابھی ہوٹل سے روٹی کھا کر آیا تھا اور اپنے کمرے میں آ کر بجلی کی انگیٹھی پر کافی بنا رہا تھا۔ کسی شناسا کی طرح مونا نے آتے ہی میرے ہاتھوں سے کافی کا ڈبہ لے لیا' پیالیاں گرم پانی سے دھوئیں اور کافی بنا کر میز پر رکھ دی۔

"ویر جی آپ کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں۔" مونا نے کافی کا پہلا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ مونا نے پہلے دن آتے ہی مجھے "ویر جی" کہہ کر بلایا تھا۔ مجھے ایسے جذباتی لفظوں سے بھی لگاؤ نہیں رہا۔ جلدی سے کسی کو ماتا جی یا بہن جی کہنا مجھے ہمیشہ بڑا اوٹ پٹانگ سا لگتا ہے۔ وہ ... کے منہ سے پہلے روز تو نہیں' مگر آج یہ لفظ سن کر مجھے برا نہیں لگا' اچھا ہی لگا۔ شاید اس لئے کہ اس لفظ کی

سادگی سے میری اور اس کی واقفیت کی راہ اور آسان ہو جاتی تھی کہ میں اس کے ساتھ کاشی کی باتیں بے جھجک کر سکتا تھا اور واقفیت کی اس آسان راہ میں کسی بھلاوے کا اندھا موڑ نہیں آسکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مونا نے ضرور میری ہی طرح سوچا ہو گا۔ اس کی یہ دور اندیشی مجھے اچھی لگی۔ میں کافی پیتے ہوئے اسے نظم سنانے لگا۔

دوسرے یا تیسرے روز مونا پھر آئی۔۔۔۔ اور پھر تو جیسے ایک سلسلہ بن گیا۔ میں انتظار کے دوران کوئی نظم ضرور لکھتا' مونا کو سناتا' وہ نظم مانگ لیتی اور ہنس کر کاشی کی کوئی نہ کوئی بات ضرور سنا جاتی۔ کبھی کہتی "میں نے آج کاشی کے بچے کے ہاتھ کاشی کو پیغام بھیجا تھا کہ بچے کی پڑھائی کے بارے میں مجھے کوئی بات کرنی ہے' اس لئے وہ اسکول آجائے۔" کبھی کہتی "آج کاشی خود ہی اسکول آگئی تھی' اسے بچے کو آدھے دن کی چھٹی دلا کر لے جانا تھا۔" اور پھر وہ بتاتی کہ کاشی کیسے مونا سے اپنے بچے کی بات کرتی' کیسے اس کے کالے بٹوے کی طرف دیکھتی رہتی تھی' کیسے ترس کر سوچتی رہتی کہ آج اس کے لئے کوئی اور نظم بھیجی گئی ہے یا نہیں۔ ایک دن مونا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کاشی مجھے ایک خط لکھ رہی تھی' لیکن بھیجنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی' ایک دن یہ حوصلہ بھی پیدا ہو ہی جائے گا۔

جس مکان میں میں نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا' مکان کے مالک اسی مکان کے نیچے کے حصے میں رہتے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن مونا کا میرے کمرے میں آنا اب تک مکان مالکن کو ضرور کھلنے لگا ہو گا۔ یہ بات میں خود بھی سوچتا تھا اور مونا سے کہنا بھی چاہتا تھا' مگر کہتا اس لئے نہیں تھا کہ مونا کو اگر یہاں آنے سے روک دوں' تو اس کے اسکول جا کر یا کسی گلی کے موڑ پر کھڑے ہو کر اس سے کاشی کی خبر پوچھنا یا بتانا مجھے اس سے بھی زیادہ دشواری میں ڈال دے گا۔ اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ مونا کے پاس کون سے دکھ کی دوا نہیں تھی' کیونکہ چند دن بعد ہی میں نے دیکھا کہ مونا کے لئے میری طرح مکان مالکن کی لڑکی بھی انتظار کرنے لگی۔ خود مکان مالکن راہ دیکھنے لگی۔ لڑکی کی شادی شاید جلد ہونے والی تھی' مونا اس کے ساتھ بیٹھ کر کتنی کتنی دیر تک اس کے کپڑوں میں گوٹا کناری لگاتی اور رسوئی میں اس کے پاس بیٹھ کر سبزی بناتی۔ ایک روز میں نے یہاں تک دیکھا کہ بیاہ والی لڑکی بیمار تھی' ماں کے ہاتھ میں سبزی کاٹتے وقت چاقو لگ گیا تھا اور شاید جھوٹے برتن مانجھنا ضروری تھا تو مونا رسوئی میں بیٹھ کر بڑی بے تکلفی سے برتن بھی مانجھنے لگی تھی۔

"ایسی لڑکیاں آج کل کہیں نہیں ہوتیں، کسی خوش نصیب ماں کی بیٹی ہے۔" مکان مالکن زینے سے چڑھتے ہوئے میرے پاس آکر کہنے لگی اور مونا نے بھی اندر سے آواز دے کر کہا "میں ابھی آئی ویرجی..." جیسے زور سے مجھے "ویرجی" کہہ کر اور مکان مالکن کو سنا کر اس نے آئے دن میرے کمرے میں آنے اور بیٹھنے کا راستہ نکال لیا تھا۔ یوں وہ میرے کمرے میں آکر بھی مجھے ویرجی ہی کہتی تھی، مگر کبھی کبھی ایسے لفظوں کو زور سے اور دوسروں کے سامنے کہنا شاید ضروری ہو جاتا ہے۔ مجھے مونا کی یہ سوجھ بوجھ اچھی لگی۔

راستہ چلتوں کی مدد کرنے کی مونا کو لگن سی تھی۔ ایک عجیب سا درد مونا کے دل میں چھوٹی سی عمر میں ہی سا گیا تھا۔ ایک رات اپنے درد کا راز اس نے مجھے خود اپنی زبان سے بتایا۔ رات کافی ہو گئی تھی، میرے دروازے پر دستک ہوئی، مونا اندر آئی، اس کے چہرے کا رنگ کسی نچڑے ہوئے کپڑے کی طرح تھا۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے تھے اور کانپ رہے تھے میرا بازو تھام کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور کانپتی ہوئی دیوان پر بیٹھ گئی۔

"ویرجی...." کپکپاتے ہونٹوں سے اس نے بمشکل تمام کہا اور نڈھال ہو کر اوندھی سی گر گئی۔ میں نے اس کو دو کمبل اوڑھائے اور کتنی ہی دیر تک اس کے بازو دباتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔ میں نے چائے بنائی، اسے کندھے کا سہارا دے کر بٹھایا، چائے پلائی اور کچھ گھبراہٹ کے ساتھ اس سے کہنے لگا کہ وہ ہمت کرے۔ سنبھل کر بٹھایا، چائے پلائی اور کچھ گھبراہٹ کے ساتھ اس سے کہنے لگا کہ وہ ہمت کرے، سنبھل کر مجھے بات سنائے اور پھر میں اس کے ساتھ جا کر گھر چھوڑ آؤں گا۔

"میں بڑی بدنصیب ہوں۔" اس نے رو کر کہا اور بعد میں آدھے ٹوٹے ہوئے فقروں میں اس نے جو کچھ مجھے سنایا وہ واقعی خوفناک تھا۔ وہ ان دنوں بچی تھی۔۔ مشکل سے بارہ برس کی، جب اس کے سگے باپ نے اس سے اپنا منہ کالا کیا تھا۔ اس کا باپ اب مر گیا تھا۔ آج اس کی ماں گھر پر نہیں تھی وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کا سگا چاچا پردیس سے آیا تھا، وہ چاچا کو روٹی کھلا کر وہ اپنے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ اس کا چاچا اس کے کمرے میں آکر زبردستی....

اب میں اس کو گھر جانے کے لئے نہیں کہہ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ نیچے جا کر اپنی سہیلی، مکان مالکن کی لڑکی کے پاس سو جائے۔ وہ نہیں مانی۔ وہ دل کی جس طرح کی حالت

میں تھی' اس طرح کی حالت میں کسی کے پاس نہیں جایا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کو اپنے بستر میں سوئی رہنے دیا' اور خود ایک کوٹ پر اوور کوٹ ڈال کر دور زمین پر سو گیا۔ کمرے میں ایک ہی دیوان ہے' جس سے میں دن کو بیٹھنے کا اور رات کو سونے کا کام لیتا ہوں' اور جہاں وہ سوئی ہوئی تھی.....

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔۔۔۔ معلوم نہیں مونا کی بد نصیبی کو سوچ کر' کہ آج کی عجیب حالت میں اپنے آپ کو سوچ کر۔۔۔ کہ مونا چیخ کر اٹھ بیٹھی! میں مونا کے دل کی حالت کو سمجھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اپنے چاچا کی صورت آ رہی تھی۔۔۔۔ چالیس پچاس برس کی عمر کا' چھ فٹ لمبا آدمی' کپڑے اتارے ہوئے' آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے' اور منہ سے آتی وہسکی کی بدبو سے جھومتا اور مونا کے گلے سے کھینچ کر کپڑے اتارتا۔۔۔ چاچے کی صورت کو رو رو کر آنکھوں کے آگے سے ہٹاتے مونا کے دل میں ایک نہیں' دو بھیانک واقعات کے تار ملے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔۔۔ مونا نے مجھے بتایا' کہ اس کے چاچے کی شکل اپنے مردہ بھائی کی طرح ہے' مونا کے باپ جیسی۔

اس رات مونا میرے بازو کے ساتھ لگ کر بار بار ڈرتی اور گھبراتی رہی۔ کئی دفعہ اس کی چھاتی کا ابھار میرے پہلو میں چبھتا محسوس ہوا تھا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اگر اس کے جسم کی اتنی نزدیکی کے ساتھ آج کے حادثے کا ماضی نہ ہوتا' تو میرا جسم اتنا جامد رہ سکتا کہ نہیں۔ مگر اس دن وہ بالکل جامد رہا تھا۔ مجھے وہ زخمی پرندے کی طرح معلوم ہوتی رہی' جس کی پیٹھ کو یا بازوؤں کو ہاتھ لگاتے مجھے صرف یہ محسوس ہوا' جیسے میں ڈرے ہوئے پروں پر ہاتھ پھیر رہا ہوں.....

اس رات کے بعد میں نے نفسیات کی کئی کتابیں لا کر پڑھیں' اور مونا کو بھی پڑھائیں میری تمنا تھی کہ مونا جیسی اچھی لڑکی کے دل پر سے اگر اس کے زخموں کے کھرنڈ اتر سکتے ہوں تو اتر جائیں' میں چاہتا تھا اس کا کنوارہ من پھر شاداب ہو جائے۔

ایک دن ایک امریکی اخبار میں مونا نے امریکن پولیس کا ایک اشتہار پڑھا' جس میں دس قاتلوں کی تصویریں اور ان کی زندگی کے کچھ حالات دیئے گئے تھے اور اعلان کیا گیا تھا' کہ جیل سے بھاگے ہوئے ان دس قاتلوں کی پولیس کو سخت ضرورت ہے۔ اشتہار شاید کسی رنگین مزاج جرنلسٹ کا لکھا ہوا تھا' عبارت بڑی چٹپٹی تھی۔ مونا مجھے ایک ایک قاتل کی تصویر دکھانے کے بعد پڑھ رہی تھی" "سنو ویرجی' یہ ایڈورڈ میس کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ اس کی تصویر دیکھی

ہے؟ دیکھنے میں پیرس کا آرٹسٹ لگتا ہے۔ لکھا ہوا ہے' اس نے سب سے پہلے اپنی بیوی کو قتل کیا' پھر کئی اور عورتوں کو۔ مگر یہ صرف ان عورتوں کو قتل کرتا ہے جن کی عمر چالیس برس سے زیادہ ہو۔ اور لکھا ہوا ہے "لڑکیو! اپنی "آنٹیوں" کو کہہ دو کہ آج کل وہ رات کو اکیلی باہر نہ جایا کریں......" مونا ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی' جیمس ایڈورڈ کینڈی کو دیکھو' پولیس نے اسے تلاش کرنے کے لئے یہ نشانی بتائی ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ پر ایک لفظ گدا ہوا ہے۔ معلوم ہے کیا لفظ؟ لو "LOVE"

مونا ہنسے جا رہی تھی اور ہنستے ہنستے پڑھ رہی تھی اور پھر مجھے یاد ہے کہ کسی قاتل کے بارے میں خبر پڑھتے ہوئے اس نے پڑھا کہ اس قاتل نے چھ قتل کئے تھے اور مجھے یاد ہے کہ میں چونک کر رہ گیا تھا' جب آگے مونا نے اپنی طرف سے کہا۔ "اسے چھ قتل نہیں کرنے چاہئے تھے۔ سات کرنے چاہئے تھے' کیونکہ سات نمبر لکی ہوتا ہے۔"

یہ سوچ کر مجھے کچھ اطمینان بھی ہو رہا تھا کہ اب مونا چاچا کا ذکر کرتی تھی تو اس طرح نہیں گھبراتی تھی' جیسے اس رات گھبرائی تھی۔ ایک روز اس نے ایک کتاب میں ایک کیس پڑھا کہ ایک خوبصورت لڑکے نے پہلے اپنی ایک بہن کے ساتھ ناجائز تعلق رکھا اور پھر اسے اور اس کے بچے کو مار کر دوسری بہن پر ڈورے ڈالے۔ اس کی تین بہنیں تھیں' تینوں بہنوں کو اس نے باری باری قتل کر دیا تھا۔ یہ کیس پڑھ کر مونا نے خدا کا شکر کیا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے اسے نہ اس کے باپ نے قتل کیا تھا اور نہ اس کے چاچا نے۔۔۔ مونا کی باتوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ روز بروز اس کے دل کے زخم بھرتے جا رہے تھے۔

ایک دن صبح کے دھندلکے میں میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مکان مالک کی لڑکی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ مجھے پچھلے دو مہینے سے پتہ تھا کہ وہ بیمار ہے مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی بیمار ہے۔ اس کی شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے تھے اور اس کی پیاز کی چھلکے کی سی شکل دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ پانچ دن میں یہ لڑکی ڈولی میں کیسے بیٹھے گی؟ وہ پہلے کبھی میرے کمرے میں نہیں آئی تھی' پہلی دفعہ آئی تھی۔ اور بڑی جھجکی سمٹی کھڑی تھی۔

"کیوں رکشا؟" لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ رکشا نے منت سے کہا "مونا دو دن سے نہیں آئی۔ میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی' ان دنوں جا بھی نہیں سکتی' آپ جیسے بھی بنے اس کو بلا دیں۔"

"اس کے گھر تو میں بھی کبھی نہیں گیا۔ شاید تیسرے بلاک میں رہتی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ وہ یہاں ہو گی نہیں، وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر اپنی کسی موسی کے پاس گئی ہے۔"

"ایک ـــــ ہفتہ ـــــ کے ـــــ لئے ـــــ" رکشا گھبرا کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئی۔

"تجھے بہت ضروری کام تھا؟" میں نے پوچھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

رکشا نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میری طرف بھی نہیں، خلا میں۔ رکشا کے جسم سے خون بہتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا، مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا تمام خون بہہ کر کہیں چلا گیا تھا اور صرف خون سے خالی جسم رہ گیا تھا۔

"میں...... مر...... جاؤں گی....." رکشا نے تڑپ کر کہا۔

"اس روز..... میری..... ارتھی..... اس گھر سے نکلے گی....."

رکشا کی بات سن کر میں نے جو اندازہ لگایا، میرا خیال ہے وہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا جہاں رکشا کی شادی ہو رہی ہے، وہ وہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ غم میں گھلتی ہوئی وہ پچھلے دو مہینے سے کھاٹ پر پڑی تھی، مگر یہ بات میری عقل میں نہیں آرہی تھی کہ مونا کو اس سلسلے میں اس کی کیا مدد کرنی تھی ـــــ شاید اس شخص کو سمجھا بجھا کر لانا تھا، جس سے رکشا پیار کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ شادی سے رکشا کو بچا لے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں رکشا! تیری یہ شادی تیری مرضی سے نہیں ہو رہی...." میں یہی کہہ سکتا تھا۔

"نہیں راکیش صاحب، یہ بات نہیں، شادی میری مرضی سے ہو رہی ہے۔" رکشا بلک اٹھی۔

"پھر ـــــ؟"

"کچی عمر میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں ویر جی! مونا آپ کو ویر جی کہتی ہے ـــــ میں بھی کہہ لوں؟ آپ کو سگے بھائی سے بھی بڑھ کر سمجھوں گی، اگر....." گھبرائی ہوئی رکشا نے میرے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ اس نے ایک دفعہ سیڑھیوں کی طرف دیکھا، جیسے دیکھ رہی ہو کہ اس کی بات کسی اور کے کان میں تو نہیں پڑی۔ پھر ڈر اور پچھتاوے کے لہجے میں

کہنے لگی "سامنے کے مکان میں ایک لڑکا دیوی کمار رہتا ہے۔ اب ایم اے میں پڑھتا ہے۔ مجھے وہ اچھا لگتا تھا۔ ڈھائی تین سال کی بات ہے' میں انجان تو تھی ہی' اسے کچھ چٹھیاں لکھ بیٹھی۔ چٹھیاں اس نے بھی لکھی تھیں۔ بات کوئی بڑی نہیں تھی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ میری تمام چٹھیاں شادی والے روز میرے "ان" کو دکھائے گا.... اس سے تو میں مرجاؤں تو اچھا ہے.."

میں نے دیوی کمار کو دیکھا تھا' تھوڑا سا جانتا بھی تھا' مگر دیکھے ہوئے چہروں کے پیچھے ان دیکھے چہرے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے رکشا کو ڈھارس بندھائی کہ میں دیوی کمار سے ملوں گا اور اسے سمجھاؤں گا۔ مگر رکشا نے جو بات آگے بتائی اسے سن کر مجھے ایسا لگا کہ میں دیوی کمار کو کچھ بھی نہ سمجھا پاؤں گا۔ رکشا نے بتایا کہ اس نے چٹھیوں کے بدلے میں اس سے دو ہزار روپے مانگے تھے۔ وہ روپیہ نہیں دے سکتی تھی' اس لئے اس نے ماں کے صندوق میں سے ایک بڑا سونے کا کنگن چرا کر مونا کے ہاتھ اسے بھیج دیا تھا۔ جواب میں مونا کو وہ چٹھیاں لا کر رکشا کو دینی تھیں' مگر چٹھیاں ابھی تک اسے نہیں ملی تھیں اور شادی میں پانچ دن رہ گئے تھے۔

" رکشا تو مجھے دیوی کمار کا خط دکھا سکتی ہے جس میں اس نے تجھے یہ دھمکی دی ہے کہ وہ.."

"ویرجی ایسی دھمکیاں کوئی لکھ کر نہیں دیا کرتا' اس نے زبانی کہا تھا کہ وہ......"

"وہ تجھ سے کب ملا تھا؟"

"مجھے نہیں ملا' اس نے مونا کے ہاتھ کہلا بھیجا تھا۔"

پتہ نہیں کتنے خیال میرے دماغ میں آئے اور گئے' مگر رکشہ کو بچانا ضروری تھا۔ میں نے ایک پیالی کافی پی۔ دفتر جانے سے پہلے دیوی کمار کے گھر پہنچا اور اسے بلا کر نہر والی سڑک پر لے گیا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں بات سیدھی کرنے کے بجائے اور الٹی نہ کردوں۔ جو شخص کسی لڑکی سے دو ہزار روپے مانگ سکتا تھا' وہ مجھے بھی کسی الجھن میں ڈال سکتا تھا۔

عجیب حالت تھی۔ میں دیوی کمار پر شک کرنا چاہ رہا تھا' مگر شک کرنے کی کوئی گنجائش بھی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے بات شروع کی۔ میں کسی پچکانے سخت اور میرے اوپر ہی کوئی الزام لگانے والے جواب کو سننے کی امید میں' میں اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کتنی دیر تک اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں چبا کر' آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو

روک کر مجھ سے کہا" "مجھے کوئی اتنا برا بھی سمجھ سکتا ہے' یہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

انسان کا دل کسی بھی رَو میں بہہ سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید دیوی کمار میرے منہ پر بات ٹالنے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے تاکہ میں رکشا کو جا کر اطمینان دلا دوں اور جب وہ بے فکر بیٹھی ہو تو آج سے پانچویں دن اس کے لئے موت کا فرشتہ بن کر پہنچ جائے مگر خیال کی یہ رو بھی دیر تک نہ رہی۔ دیوی کمار کے کہنے کے مطابق اسے چٹھیوں والی بات کا خیال بھی نہ تھا' وہ چٹھیاں تو اس نے ان ہی دنوں پھاڑ دی تھیں' مونا نام کی لڑکی سے کبھی ملا ہی نہیں تھا' نہ اس نے مونا کے ذریعہ رکشا کو کوئی دھمکی دی تھی' نہ کوئی سونے کے زیور لے کر اس کے پاس آیا تھا۔ دیوی کمار نے مجھے یقین دلانے کے لئے یہاں تک کہا کہ اگر میں چاہوں تو اسے ایک ہفتہ کے لئے اپنے کسی دوست کے مکان پر قیدی کی طرح رکھ لوں' تاکہ شادی والے دن کسی قسم کے خطرے کا اندیشہ نہ رہے۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟ میرے لئے صرف یہ راہ تھی کہ دیوی کمار کی بات پر یقین کر لوں' یا یہ ہو سکتا تھا کہ مونا کو کہیں سے ڈھونڈ کر دیوی کمار کے سامنے لاؤں اور بات کی تہ تک پہنچوں۔

مونا کا مکان ڈھونڈ کر میں اس کے یہاں پہنچا۔ دیوی کمار بھی میرے ساتھ تھا۔ مونا کی ماں نے جیسے ہی مجھے دیکھا' بڑے پیار سے اندر آنے اور بیٹھنے کے لئے کہا' جیسے وہ مجھے جانتی ہو۔ شاید اس نے مونا کے منہ سے میرا ذکر سنا ہو گا۔

"میں تو بیٹے خود ہی سوچتی تھی کہ تیرے گھر جاؤں' تیرے آگے جھولی پھیلا دوں.... مونا کی ماں نے جب مجھے کمرے میں بٹھا کر اور خود میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تو میں سر سے پاؤں تک ہل سا گیا۔ میں ہڑبڑا کر بولا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ نے مجھے غلط پہچانا ہے۔"

"تن بوڑھا ہو جاتا ہے بیٹے! نظر بوڑھی نہیں ہوتی' میں نے تجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ راکیش نام ہے نا تیرا؟ میں نے تیری تصویر دیکھی ہے۔" اس نے جب یہ کہا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک مرتبہ مونا کو ایک تصویر دی تھی۔۔۔۔ مونا کو نہیں' مونا کے ہاتھ کاشنی کو۔ اور میں سوچنے لگا کہ مونا نے میری وہ تصویر اپنی ماں کو دکھائی ہو گی۔

"تیرے نام کی مالا جپتی ہے۔ تیری جوگن بن گئی ہے۔ میں اس کے دل کی بات نہیں سمجھوں گی بھلا؟ جو کتاب وہ روز رات کو پڑھتی ہے' تیری تصویر اس نے اسی کتاب میں رکھ چھوڑی

ہے۔"

"میری تصویر!" مجھے نہیں! میرے سپنوں کو ایک چوٹ سی لگی اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ مونا نے میری تصویر ابھی تک کاشنی کو کیوں نہیں دی تھی۔

"یہ دیکھ بیٹا! میں چاہے دور کھاٹ پر سوئی ہوتی ہوں مگر جتنی دیر تک آنکھ نہیں لگتی' یہ تاڑ لیتی ہوں کہ وہ ایک دو صفحے پڑھتی ہے اور پھر کتنی ہی دیر تک تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک صندوقچی لے آئی اور اس میں سے ایک کتاب نکالتے ہوئے بولی "کتاب تو انگریزی کی ہے' پتہ نہیں کیا ہے اس میں' مگر وہ اسے باقاعدہ گیتا کی طرح پڑھتی ہے۔"

میں نے کتاب ہاتھ میں لی اور کتاب سمیت میرا ہاتھ ٹھٹھک گیا "قتل کی ان سائیکلوپیڈیا" کتاب کا نام دیوی کمار نے بھی پڑھ لیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔

کتاب میں میری تصویر رکھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ اس طرح جیسے صفحہ تلاش کرنے کی نشانی رکھی ہو۔ کسی کسی صفحہ پر کسی جملے کے نیچے لال پنسل کی لکیر تھی۔ ایک لکیر والا جملہ میں نے پڑھا' لکھا تھا' "چھ قتل وہ کر چکا تھا' ساتواں قتل اس نے صرف اس لئے کیا تھا کہ اس کے خیال کے مطابق سات نمبر لکی ہوتا ہے۔"

پچھلے کتنے ہی دن تتلیوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور پھر لال لکیر والا جملہ میں نے پڑھا۔ یہ کتاب کے دیباچہ میں لکھا تھا۔ اس بات کی کوئی سائنٹیفک وجہ تو نہیں' مگر ہے یہ عجیب بات کہ جو قاتل بہت مشہور ہوئے ہیں' ان کے نام اکثر "س" سے لے کر "م" تک کے حروف سے شروع ہوتے ہیں۔۔۔۔ اور میرے کانوں میں گونجنے لگا مونا لیزا۔۔۔۔۔ میرا نام "س" سے شروع ہوتا ہے' مگر میں چاہتی ہو کہ میرا نام ایسا ہو جو "س" سے لے کر "م" کے کسی حروف سے شروع ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زبان میرے منہ میں لکڑی کی طرح سوکھتی جا رہی ہے۔

اس وقت میرے چہرے پر ظاہر ہے' خوشی کی جھلک نہ ہوگی' اس نے بھی دیکھا ہوگا' میری تصویر میرے ہاتھ میں تھی' اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس یاد کرنے لگی۔۔۔۔۔ شاید صرف باتیں کرنے کے لئے "اپنی ہمت سے ہی اتنی پڑھ لکھ گئی ہے' نہیں تو سر پر باپ نہیں ہے کون پڑھاتا؟" باپ کا ذکر سنتے ہی میرے دل میں خراش سی پڑ گئی۔ میں نے پوچھا "جب اس کے پتاجی چل بسے تو وہ کتنے برس کی تھی؟"

"جانے کس جنم میں میں نے پاپ کیا تھا بیٹا! ادھر یہ لڑکی گود میں آئی اور ادھر اس کا باپ چل بسا......" وہ پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ پیروں کے نیچے سے زمین نکلنے کا محاورہ میں نے سن تو رکھا تھا' مگر اس وقت مجھے سچ مچ ایسا لگا کہ میرے پیروں کے نیچے سے نکل کر پتہ نہیں زمین کہاں چلی گئی ہے؟ کسی زمین کو سنبھالنے کی کوشش میں میں نے کہا۔ مشکل سے دس بارہ سال کی ہوگی۔ جب اس کا باپ........

"دس بارہ برس کی کہاں بیٹا۔ دس بارہ مہینے کی۔ اسے تو باپ کا ہوش بھی نہیں۔"

مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل تو گئی تھی' مگر مجھے کوئی اور زمین مل گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا" "تم نے بڑی مصیبت کے دن دیکھے ہوں گے؟ اس کے چاچا تاؤ نے پالا اور پڑھایا ہوگا!"

"نہ کوئی آگے' نہ کوئی پیچھے' ادھر اس کے ننہال میں کوئی ماما نہیں۔ ماما کو بڑی ممتا ہوتی ہے بیٹے! ادھر اس کے باپ کے خاندان میں بھی نہ کوئی چاچا نہ تاؤ۔ تاؤ بھی ہو تو ناک رکھنے کے لئے کچھ کرتے ہی ہیں نا!"

وہ پلو سے ابھی تک آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دیوی کمار بھی کھڑا ہو گیا۔

"بیٹا بغیر منہ جھوٹا کیے ہی چل دیئے؟ کچھ منٹ بیٹھ جاؤ' میں چائے بنائے لاتی ہوں۔" بات اس کے منہ میں تھی کہ میں دہلیز پر تھا۔

اس کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ مونا کب اپنی موسی کے گاؤں سے آئی ہوگی۔ اس کی ماں نے اس سے کیا پوچھا اور کیا بتایا ہوگا۔ مونا پھر مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ رکشا کی شادی ہو گئی' مگر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ صرف گھر میں ایک کھلبلی سی مچ رہی تھی کہ گھر میں سے کسی بھیدی نے سونے کا کنگن چرا لیا ہے۔ رکشا چپ رہنا چاہتی تھی۔ مونا کو دیئے ہوئے کنگن والی بات بتاتی تو پوری بات بتانی پڑتی۔ وہ یہی شکر کر رہی تھی کہ کنگن کھو کر اس کی جان تو آفت سے بچی۔ دیوی کمار ویسے رکشا کو کوئی پیغام یا تحفہ شاید نہ دیتا مگر اب یہ دکھانے کے لئے کہ اسکے دل میں کوئی رنجش نہیں ہے اس نے میرے ذریعے ایک گھڑی اور کچھ کتابیں رکشا کو بھیجیں۔

میں مونا سے ایک دفعہ ملنا چاہتا تھا۔ ایک ایک بات پوچھ کر اس کے چہرے کا رنگ دیکھنا چاہتا تھا...... مونالیزا کے چہرے کا رنگ۔ پھر سنا کہ مونا کی شادی ہو گئی۔ یہ خبر مجھے مکان کی مالکن

نے بتائی تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے یہ بھی کہا'' لوگ تو تل کا پہاڑ بنا لیتے ہیں' کہتے ہیں اسے دن چڑھے ہوئے تھے' اس لئے راتوں رات اس کے پھیرے ڈال دیئے گئے کیا پتہ سچ ہی ہو۔ اس لئے کہ سنا ہے شوہر بڑی عمر کا ہے' ویسے کہتے ہیں' بڑی زمین کا مالک ہے۔ لوگوں کو جلن بھی تو بہت ہوتی ہے' کسی کو خوش دیکھ کر خوش نہیں ہوتے'''' اور اس کے بعد وہ مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگی۔ '' تجھے بھی اس نے بیاہ کی خبر نہ دی؟ ویسے تو ویرجی' ویرجی' کہتے ہونٹ سوکھتے تھے''۔

کچھ مہینے بیت گئے' ایک دن مکان مالکن نے مجھے دفتر سے آتے ہوئے دروازے پر ہی روک لیا اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہنے لگی'' تو نے کچھ سنا ہے؟ میں نے تو ظلم کی بات سنی ہے۔ کل جگ ہے کل جگ!'' اس نے اپنی بات میں ابھی تک مونا کا نام نہیں لیا تھا' مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ اسی کی بات کہہ رہی تھی' کہنے لگی'' آنکھوں سے دیکھا نہیں۔ مگر سنا ہے کہ دروازے میں گھستے ہی' حویلی اس نے اپنے نام لکھوالی تھی' پتہ نہیں اسے کیا دکھ تھا کہ پرسوں اپنے سوتے ہوئے شوہر کے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر کہتے ہیں کہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ساری رات ٹکڑے کاغذوں میں باندھتی رہی۔ رنگین کاغذوں پر اس نے چاندی کے ورق لگائے اور ٹوکرے میں اس طرح رکھ لئے جیسے پنڈیاں رکھی ہیں۔ صبح کو جب نوکر چاکر جاگے تو ان سے کہنے لگی کہ شاہ جی صبح ہی کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ پھر موٹر میں ٹوکرے رکھوا کر وہ خود ہی موٹر چلا کر کہیں چلی گئی۔ شاید کسی کنوئیں یا کھائی میں پھینکنے گئی ہوگی۔ کم بخت نے چاندی کے ورق اس لئے لگائے ہوں گے کہ گھر کے نوکروں کو کوئی شک نہ ہو۔ دوپہر کے وقت لوٹ آئی۔ دو دن تک تو کسی کو شک نہیں ہوا' مگر خون کہاں چھپا ہے؟ سات پردوں میں بھی بولتا ہے۔ شاہ جی باہر سے لوٹ کر ہی نہیں آئے۔ پھر پتہ نہیں منشی منیموں کو شک ہو گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر دے دی اور پھر کہتے ہیں کہ پولیس نے کچھ چیلیں دیکھیں' جن کی چونچوں پر ورق لگے ہوئے تھے۔ پولیس نے وہ پورا علاقہ چھان مارا جہاں چیلیں بار بار اڑتی تھیں۔ اور پھر جو ڈھونڈنا تھا ڈھونڈ لیا۔ پولیس دروازے پر آ بیٹھی۔ پولیس کے ہاتھوں سے بچ کر چنڈال کہاں جاتی؟ اس نے اندر گھس کر کنڈی لگالی اور پتہ نہیں کیا پھانک لیا۔ پولیس نے جب دروازہ توڑ کر اسے نکالا تو وہ مرنے کے قریب تھی۔ پولیس والے اسے ہسپتال لے گئے' پتہ نہیں بچتی ہے کہ نہیں؟ ویسے بھی پورے دنوں سے تھی۔

اس کی ماں کو خبر دینے آج کوئی منشی آیا تھا۔ تمام باتیں پڑوسیوں کو بھی سنا گیا ہے۔ صبح

اخباروں میں بھی یہ بات آجائے گی.....“

بات اخباروں میں آئی تھی آگئی' اور پھر یہ بھی آگئی کہ وہ ہسپتال میں مرگئی تھی۔ اس بات کو بھی کتنے ہی دن گزر چکے ہیں' مگر کبھی بیٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں تو میرے سامنے ایک طرف میری وہ نظمیں آجاتی ہیں' جو میں نے کاشنی کے لئے لکھی تھیں' یا یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو مونا نے کاشنی کے نام پر مجھ سے لکھوائی تھیں' اور ایک طرف ”قتل کا انسائیکلوپیڈیا“ کا نیا ورق تھا' جو اس کتاب سے باہر ہے' پھر بھی اس کتاب ہی میں ہے اور ان دونوں کے بیچ میں رہ جاتی ہے--- مونالیزا' نہیں مونالیزا نمبر ۲' اور اس کی وہ تمام باتیں جنہیں وہ خود ہی گڑھتی تھی اور آپ ہی سناتی تھی اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کسی کی حیرانی اور پریشانی کو دیکھ کر وہ مسکرانا چاہتی تھی--- مونالیزا جیسی مسکراہٹ۔

نہیں---- معصوم رازدارانہ مسکراہٹ' نہیں خوف ناک رازدارانہ مسکراہٹ!

گھائل خواب

سورج کی کرنیں جھکیں اور اس نے آہستہ سے گلاب کی ایک ٹہنی کو چھوا۔ ایک مرد کی نظریں جھکیں اور اس نے آہستہ سے رانی کے ہونٹوں کو چھوا۔ ٹہنی پر ایک پھول کھل اٹھا۔ ہونٹوں پر مسکان کھل آئی۔ اس مرد نے گلاب کے پھول کو بھی سونگھا اور رانی کے ہونٹوں کو بھی۔ رانی نے پہلے گلاب کا پھول توڑا اور اس مرد کے کوٹ پر ٹانک دیا۔ پھر اپنے ہونٹ کی مسکان چھوئی اور اس مرد کے ہونٹوں پر رکھ دی۔

رانی کی کومل' جوان بانہوں کو اس مرد نے اپنی طاقتور جوان بانہوں میں کسا اور رانی کے کان میں اس کے ایک ایک انگ کے لئے وہ تشبیہات استعمال کیں۔ جو صدیوں سے ایک جوان مرد کی آواز ایک جوان عورت کے کانوں میں دہراتی آرہی ہیں۔

روئیں روئیں سے اٹھتی کپکپی سے رانی کی نیند اچٹ گئی۔ گذرے ہوئے لمحات سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ مگر ان میں ایک گہری فکر تھی کہ یہ سچ نہیں تھا' محض ایک خواب تھا..... رانی نے آہستہ سے اپنی چارپائی سے اٹھ کر' سامنے کی الماری میں پڑا ہوا خط نکالا' کمرے کی ایک کھڑکی کھولی' صبح کی ہلکی روشنی میں خط کو پڑھا اور پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو تسلی دینے لگی کہ آج کا یہ خواب سچ بھی ہو سکتا ہے۔

رانی نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ایک ایک انگ کو دیکھا اور رات کے خواب میں سنی ہوئی تمام تشبیہات اس کو یاد آگئیں۔ سرو کے بوٹے جیسا قد' صندل کی گیلی جیسی بانہیں' بھلیاں جیسی انگلیاں' آم کی پھانک جیسی آنکھیں گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ۔

اور جس طرح ہر عورت کو مرد کے منہ سے اس قسم کی تشبیہات سن کر احساس ہوتا ہے

کہ یہ تمام تشبیہات صرف اسی کے انگوں کے لئے بنائی گئی تھیں' رانی کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا کہ یہ تمام تشبیہات صرف اسی کے انگوں کے لئے بنی تھیں' یا اس کے اَنگ اِن تشبیہات کے لئے بنے تھے۔

رانی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ باہر کے باغیچے میں سے گلاب کا ایک پھول توڑا اور ہونٹوں پر ایک مسکان بھر کر سامنے طویل رہگذر کی طرف دیکھنے لگی' جیسے اسے خط لکھنے والا ابھی اسی رہگذر پر تیکھے قدم رکھتا اس کے پاس آ جائے گا۔ اور اس کے ہاتھ کے تازہ پھول اور اس کے ہونٹوں پر کھلی ہوئی مسکان کو اونگھ لے گا۔

رانی کچھ دیر سامنے کی رہگذر کو تکتی رہی' پھر اسے ایک ہلکی سی آواز آئی:۔

"رانی!...... رانی!......"

لیکن یہ آواز سامنے کی رہگذر سے نہیں آئی تھی' اس کے عقب سے رانی کی بڑی بہن کے کمرے سے آئی تھی۔ رانی نے ہولے سے انگڑائی لی اور بہن کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے جواب دیا:۔

"ہاں ملکہ! آ رہی ہوں!"

بند دروازے کو کھول کر جب وہ بہن کے کمرے میں پہنچی' تو اس کی بہن نے جلدی سے کہا "دروازہ بھیڑ دو رانی! بڑی تیز ہوا آ رہی ہے!"

"لیکن آج تو ہوا بڑی اچھی لگ رہی ہے۔" رانی نے یکبارگی کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

"ہوا میری ہڈیوں کو چیرتی ہے مجھ سے ذرا بھی برداشت نہیں ہو سکتی۔" ملکہ نے اپنے اوڑھے ہوئے کمبل کو کس کر دبایا اور کہا۔

"رات نیند کیسی آئی؟" چارپائی پر بیٹھتے ہوئے رانی نے آہستہ سے پوچھا۔

"آج رات کیا کوئی خاص نیند آنے والی تھی' روز کے مقابلے میں؟ اسی طرح اکھڑی اکھڑی جیسے روز آتی ہے۔"

رانی کچھ دیر خاموش رہی' پھر یک بیک اس کے منہ سے نکلا:۔

"کبھی تمہیں خواب بھی تو آتے ہوں گے ملکہ!"

رانی شاید ملکہ کے خوابوں کے بارے میں اتنا نہیں سوچ رہی تھی" جتنا اپنے رات کے

خواب کے بارے میں' اور خواب کا تذکرہ چھیڑ کر شاید اپنی بہن کو رات والا خواب سنانا چاہتی تھی۔

"خواب؟ خواب ہی تو ساری عمر دیکھتی رہی ہوں کیا سوتے میں کیا جاگتے میں۔"

"یہ صبح بڑی اچھی ہے' جو تمہاری اور میری جیسی عورتوں کو بہلاوا دینے کے لئے روز آ جاتی ہے۔"

"خواب سچے نہیں ہوتے۔"

"خواب سچ نہیں ہوتے' صرف گھائل ہوتے ہیں۔"

"ملکہ!"

"چل چھوڑ ان خوابوں کی باتیں' ان کی باتیں کرتے کرتے تو میری زبان بھی زخمی ہو گئی ہے۔"

"اٹھو ملکہ! باہر باغیچے میں چلیں' دیکھو تو باہر کیسا موسم ہے۔"

"کیسا موسم ہے؟"

"بہار کا۔"

"پگلی!"

"نہیں ملکہ' سچ مچ بہار کا موسم ہے۔"

"اس دنیا میں بہار کا موسم نہیں ہوتا رانی! یہ صرف ویرانی ہوتی ہے' جو کبھی کبھی بہار کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔"

گھبراہٹ میں رانی کا ہاتھ اپنے سینے پر چلا گیا۔ ابھی جو خط رانی نے الماری سے نکال کر صبح کی ہلکی روشنی میں پڑھا تھا وہ اس وقت رانی کی جھولی میں رکھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے رانی؟"

"یہ خط......"

"بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"بہت اچھا......"

"زندگی کے اقراروں سے بھرا ہوا۔"

"ہاں! زندگی کے اقراروں سے بھرا ہوا۔"

"یہ الفاظ تو نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔"

"لیکن ملکہ......"

"یہ سب الفاظ ڈکشنری میں ہوتے ہیں۔"

"لیکن جب کوئی خط میں لکھتا ہے......"

"تب ان کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا' جب کہ ڈکشنری میں ان کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔"

"ملکہ!"

"میرے سرہانے ایک چابی پڑی ہوئی ہے' یہ چابی لے لے' اور میرے سامنے کی الماری کھول کر دیکھ لے' وہاں ایک نہیں بہت سے خط پڑے ہوئے ہیں۔ تمہارے اس ایک خط جیسے کئی خط...."

"آج خواہ تم مانو یا نہ مانو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جاؤں گی۔ دیکھو تو تمہاری حالت دن بدن کیسی ہوتی جا رہی ہے؟"

رانی نے بڑے غور سے ملکہ کے چہرے کو دیکھا اور اسے وہ سب تشبیہات یاد آ گئیں' جو اس نے رات خواب میں سنی تھیں' اور رانی کو ملکہ کا وہ روپ یاد آیا جو ملکہ کے چہرے پر سماتا نہ تھا۔ حقیقتاً ملکہ بہت خوبصورت تھی۔ رانی سے کہیں زیادہ خوبصورت' کیونکہ اس کے تن کے روپ میں اس کے من کا روپ بھی شامل تھا۔ رانی جانتی تھی۔ وہ ملکہ کی صورت کو دیکھ کر کانپ اٹھی' جیسے آج بستر پر ملکہ بیمار نہیں پڑی ہو' عورت کے روپ کو دی جانے والی اس دنیا کی ہر تشبیہ بیمار پڑی ہوئی تھی۔

رانی نے چائے بنائی۔ ملکہ کو پلائی خود بھی پی اور پھر علی الصبح ملکہ کو شہر کے سرکاری اسپتال لے گئی۔

اسپتال میں بے حد بھیڑ تھی۔ رانی کبھی پہلے اسپتال میں نہیں آئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آج ساری دنیا بیمار پڑ گئی ہے۔

ڈاکٹر شری چند اسپتال کا سب سے بڑا ڈاکٹر تھا۔ رانی نے اس کے کمرے کا پتہ دریافت کیا اور ملکہ کو کمرے کے باہر ایک گوشے میں بٹھا کر اس سے ملنے کا انتظار کرنے لگی۔

دوپہر ہونے کو آئی ملکہ کے زرد رنگ پر ایک اور زردی چھا گئی۔ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ملکہ نے آہستہ سے کہا' "کیوں مجھے بیگانے در پر لا کر مارتی ہے۔ مرنا ہی ہے تو اپنی چارپائی پر پڑی پڑی مروں گی..... اپنے دروازے کے آگے"

"بس اگلی باری ہماری ہے' اب تو سارے مریض فارغ ہو گئے۔"

آخر ملکہ کی باری آئی۔

رانی نے اسے اپنی بانہہ کا سہارا دیا۔ اور ڈاکٹر کے کمرے میں لے گئی۔

ڈاکٹر نے میز پر رکھے ہوئے اسپتال کے فارم کو دیکھا اور ہاتھ میں قلم پکڑتے ہوئے پوچھا:۔

"کیا نام ہے مریض کا؟"

"ملکہ۔"

"ملکہ۔" ڈاکٹر نے مریض کے کپڑوں اور بکھرے ہوئے روپ کو دیکھا' اور مسکرا کر کاغذ پر لکھا "ملکہ"

ملکہ کے ماتھے پر ایک ہلکی سی تیوری چڑھی' اور پھر اس نے ہنس کر کہا' "یہ کوئی عجیب بات نہیں' میرے پاس ایک بہت بڑی سلطنت ہے' اس لئے میرا نام ملکہ ہے!"

ڈاکٹر شاید سلطنت کا نام پوچھنے والا تھا' لیکن جب اس نے ملکہ کی آنکھوں کی جانب دیکھا تو اس کی نظر بڑی سنبھلی ہوئی اور تیکھی تھی ----- ڈاکٹر نے صرف اتنا کہا' "کیا تکلیف ہے؟"

"ایک تو مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ کسی بھی چیز سے نہیں مٹتی اور دوسرے مجھے پیاس بھی بہت لگتی ہے....."

"اس کو غیر قدرتی بھوک کہتے ہیں۔"

"معلوم نہیں اس کو غیر قدرتی بھوک کہتے ہیں یا قدرتی بھوک۔ کئی بار شیشیوں پر غلط لیبل بھی لگ جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر قدرے چونکا' مگر پھر اس نے سنبھل کر ملکہ کو کمرے کے دائیں گوشے میں رکھے ہوئے تخت پوش پر لیٹنے کو کہا' جہاں وہ مریضوں کا معائنہ کرتا تھا۔ ملکہ لیٹ گئی۔

ڈاکٹر نے گھنٹی بجائی' اور دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

چند منٹ گذرے ڈاکٹر نے پھر گھنٹی بجائی' لیکن کوئی بھی اندر نہ آیا۔

"نا معلوم سسٹر کہاں چلی گئی ہے؟" ڈاکٹر نے کہا' اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کو پھر ایک بار دبایا۔

چپڑاسی اندر داخل ہوا۔

ڈاکٹر نے کسی قدر غصے میں چپڑاسی سے کہا کہ وہ جلدی سے نرس کو ڈھونڈھ کر لائے۔

"ابھی نرس کا کوئی کام نہیں ڈاکٹر!" ملکہ نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن نرس کے آئے بغیر میں آپ کے پاس آکر آپ کا معائنہ نہیں کر سکتا۔ کوئی مرد ڈاکٹر کسی مریض عورت کے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا' جب تک کوئی نرس موجود نہ ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"یہ گواہی دینے کے لئے کہ ایک صحت مند ڈاکٹر نے ایک بیمار عورت کے جسم کو ہاتھ لگایا ہے' تو کسی بری نیت سے نہیں۔" ملکہ ہنس پڑی۔ وہ بیمار تھی لیکن اس کی ہنسی بیمار نہیں تھی۔

"ہاں! اسی لئے۔"

"یعنی ایک مرد کا ہاتھ جب کسی عورت کے جسم کو چھوتا ہے' تو اس کا اصل سبب ایک ہی ہو سکتا ہے.... چاہے وہ ہاتھ ڈاکٹر کا ہو اور وہ جسم مریض کا.....!"

یہ ہمارے اسپتال کا اصول ہے....."

"ہماری دنیا میں اتنی گیہوں کی فصل نہیں ہوتی یا کسی بھی اناج کی' جتنی اصولوں اور قانونوں کی فصل ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر نے چونک کر مریضہ کی طرف دیکھا' غالباً کچھ کہتا' مگر کمرے میں نرس آ گئی تھی۔

ڈاکٹر نے مریضہ سے کچھ کہنے کی بجائے نرس سے کہا:۔

"ایک مریض کو دیکھنا ہے۔"

نرس ملکہ کے پاس ٹھہر گئی' اور ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھتے ہوئے پوچھا:۔

"جسم کے کسی حصے میں درد بھی ہوتا ہے؟"

"ہر عضو میں....." ملکہ نے بتایا۔
ڈاکٹر نے اسٹیتھیسکوپ لگا کر اس سے کہا "لمبی لمبی سانس لیجئے۔"
"میں ہمیشہ ہی لمبی سانس لیتی ہوں۔"
"سانس لینے میں زحمت ہوتی ہے؟"
"ہر سانس لینے میں......"
ڈاکٹر نے ملکہ کے جگر کو دیکھا "جگر بڑھا ہوا نہیں۔"
اگر بڑھا ہوا نہیں "تو گھٹا ہوا ضرور ہو گا۔ "ملکہ نے آہستہ سے کہا۔
ڈاکٹر نے ایک گہری نظر ملکہ پر ڈالی اور پھر نرس سے کہا "خون کی جانچ کرنی پڑے گی' اس کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گا! ڈاکٹر اپنی کرسی پر بیٹھ کر سامنے رکھے ہوئے اسپتال کے سرکاری کاغذات کی خالی جگہوں کو پر کرنے کے لئے ملکہ سے دریافت کرنے لگا:۔

"عمر؟"

"عمر؟"

"یہی جب انسان زندگی کی ہر شے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے' اور پھر سوچتا ہی چلا جاتا ہے...... تیس بتیس سال"
"آپ کے مالک کا نام؟"
"میں گھڑی یا سائیکل نہیں ہوں کہ میرا کوئی مالک ہو۔ میں عورت ہوں۔"
"میرا مطلب ہے کہ آپ کے شوہر کا نام؟"
"میں بے کار ہوں' نوکری نہیں کرتی۔"
"میں نوکری کے متعلق نہیں پوچھ رہا ہوں۔"
"میرا مطلب ہے کہ میں کسی کی بیوی مقرر نہیں ہوئی۔"
"بیوی مقرر نہیں ہوئی......"
"میرا مطلب ہے کہ ہر ایک کسی نہ کسی کام پر لگا ہوتا ہے' جیسے آپ ڈاکٹر مقرر ہوئے' یہ میرے قریب کھڑی ہوئی لڑکی نرس مقرر ہوئی' آپ کے دروازے کے باہر کھڑا ہوا شخص چپراسی مقرر ہوا' اسی طرح جب لوگ شادی کرتے ہیں تو مرد شوہر مقرر ہوتا ہے اور عورتیں

گھائل، کسی کا خواب گھائل......!" ملکہ نے کھڑکی کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ملکہ کے زرد اور نرم چہرے کو کتنی ہی دیر تکتا رہا، پھر ہاتھ میں لئے ہوئے ایک کاغذ کو دیکھ کر بولا "آپ کے خون کی جانچ کا نتیجہ آگیا ہے مگر......"

"کیا عیب نکلا ہے میرے خون میں؟"

"سرخ جراثیم.... سفید جراثیم...... سب ٹھیک ہیں، کسی جانی پہچانی بیماری کے جراثیم بھی اس میں نہیں ملتے...... مگر کچھ عجیب طرح کے جراثیم اس میں ملے ہیں، جنہیں ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ کون سے جراثیم ہیں۔"

ملکہ مسکرائی اس کی آواز دن بدن بڑھتی ہوئی تکلیف سے دھیمی ہوتی جا رہی تھی، مگر اس کی کھلتا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی دھیمی اور کومل آواز میں اس نے کہا، "آپ جتنے دن چاہیں، ان جراثیم کو پرکھ لیں، اور اگر پھر بھی آپ کچھ نہ سمجھ سکیں، تو میں بتاؤں گی کہ یہ جراثیم کون سے ہیں۔"

ڈاکٹر نے بڑی گہری نظر سے ملکہ کو دیکھا، اور پھر کسی قدر تعجب انگیز لہجے میں بولا:۔

"آپ جانتی ہیں؟"

"ہاں!"

"ہم سب ڈاکٹر آج انہیں پرکھتے جانچتے تھک گئے ہیں، سوچ رہے تھے کہ آپ کے خون کے کچھ قطرات کسی اور ملک کے ڈاکٹر کو بھجوائیں، دوسرے ممالک کی سائنس ہمارے یہاں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔"

"بھیج کر دیکھ لیجئے، شاید وہ بھی نہ جان سکیں۔"

"لیکن آپ نے یہ کیسے کہا کہ آپ جانتی ہیں؟"

"کیوں کہ میں حقیقتاً جانتی ہوں!"

"پھر آپ فوراً ہمیں بتا دیجئے۔"

"میں بتا دیتی ہوں، لیکن آپ یقین نہیں کریں گے۔"

"آپ اس کا علاج بھی جانتی ہیں......؟"

"ہاں!"

"پھر آپ وہ علاج کرتی کیوں نہیں؟"

"میں اپنا آپریشن آپ کیسے کر سکتی ہوں' وہ تو آپ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔"

"اگر ہم آپ کا بتایا ہا علاج کر دیں' آپ ٹھیک ہو جائیں' تو ہمیں یہ سب ماننا ہی پڑے گا کہ یہ کون سے جراثیم ہیں؟"

"آپ نے پاربتی کی ایک کہانی سنی ہے کہ نہیں؟"

"پاربتی کی کہانی؟"

"کہتے ہیں' ایک بار شوجی کہیں باہر گئے ہوئے تھے' انہوں نے بہت دیر لگا دی' تب اکیلی پاربتی کا دل نہیں لگتا تھا' اس لئے اس نے اپنے جسم کا میل اتار کر ایک بچہ بنا لیا.....!"

ڈاکٹر کے چہرے پر ہنسی اور شرمندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا'

"میں اس پگلی عورت سے خواہ مخواہ مغزماری کر رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا...."

"میں نے کہا تھا نا کہ آپ کو مجھ پر یقین نہیں آئے گا۔"

"یہ کوئی یقین کرنے کی بات ہے؟"

"اچھا پھر رہنے دیجئے اس بات کو۔ آپ یونہی ان جراثیم کو پہچان لیجئے۔ اگر جان سکیں تو؟"

ڈاکٹر کے دماغ میں ایک ہلچل مچ گئی' وہ سوچنے لگا' اس عورت کے ہوش و حواس درست بھی ہیں اور نہیں بھی' اس نے صرف اتنا کہا' "اچھا' میں ساری بات سنوں گا' آگے بتائیے۔"

"جس طرح پاربتی نے اپنے جسم کے میل سے ایک بچہ بنا لیا تھا' اسی طرح عورت ذات نے اپنے دل کے خون کو' پسینے کو' اور آنسوؤں کو ملا کر مجھے جنم دیا تھا۔ اس لئے میرے خون میں آپ کو عجیب و غریب جراثیم ملے ہیں' جنہیں آپ پہچان نہیں پاتے۔"

ڈاکٹر نے اپنی پیشانی پر ابھرا ہوا پسینہ پونچھا اور پھر کہنے لگا' "آپ کی اس بیماری کا نام کیا ہے؟"

"سوچنے کی بیماری..... ہر شے کے متعلق سوچنے کی بیماری۔"

"اس کا علاج؟"

"آپ جانتے ہیں ہر انسان کے پیٹ میں داہنی طرف ایک پتلی سی آنت (ناڑی) ہوتی ہے، کئی بار خوارک کا کچھ حصّہ اس میں جمع ہو جاتا ہے جو پڑا پڑا سڑنے لگتا ہے۔ آدمی دن بدن زرد اور کمزور پڑتا جاتا ہے۔ اور اگر آپریشن کے ذریعے اس آنت (ناڑی) کو نہ کاٹا جائے تو وہ کسی دن خود ہی پھٹ جاتی ہے، پھر اس کا زہر سارے جسم میں سرایت کر جاتا ہے اور آدمی مرجاتا ہے....."

"ہاں!"

"اسی طرح انسان کے سر میں ایک رگ ہوتی ہے جس میں خیالات کا کچھ حصہ جمع ہو جاتا ہے، پھر پڑا پڑا سڑنے لگتا ہے۔ کسی دن پھٹ بھی جاتا ہے اور پھر آدمی اس کے زہر سے مر جاتا ہے۔"

"اس کا ثبوت کیا ہے؟"

"ایکسرے کر کے دیکھ لیجئے۔ یہ میں نہیں جانتی کہ آپ کی سائنس نے ابھی اتنی ترقی کی ہے کہ نہیں کہ اس رگ کی تصویر لی جاسکے، اگر آپ میری بات مانیں...."

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"کہ آپ میرے سر کا آپریشن کر کے دیکھ لیجئے، آپ کو یہ رگ ضرور مل جائے گی۔"

ڈاکٹر کچھ دیر چپ چاپ ملکہ کی صورت دیکھتا رہا، پھر بغیر کچھ کہے وارڈ سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن صبح جب ڈاکٹر چکر لگانے آیا، تو ملکہ کی حالت کل سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کو ملکہ کی آواز سننے کے لئے اس کے سرہانے جھکنا پڑا۔

ملکہ کہہ رہی تھی، "ڈاکٹر آپ نے میری بات نہیں مانی..... اب بھی مان لیجئے..... مجھے آپریشن والے کمرے میں لے چلئے..... میرا خیال ہے کہ میرے سر کی رگ پھٹنے والی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا، "آج ایکسرے کر کے دیکھتے ہیں۔"

"ابھی آپ کی سائنس نے اتنی ترقی کہاں کی ہے کہ....." ملکہ کی آواز ٹوٹنے لگی۔

ڈاکٹر شری چند نے برابر کے کمرے میں جا کر کچھ اور ڈاکٹروں کو ٹیلیفون کیا کہ وہ وارڈ نمبر ۲۰ میں آجائیں، اور جب وہ لوٹ کر ملکہ کے پاس آیا تو اس کے ہاتھ میں انجکشن لگانے کا

سامان تھا۔

"یہ کیا ڈاکٹر؟"

"ہاتھ ادھر کرو، میں ایک انجکشن لگاؤں گا۔"

"دل کی طاقت کا!"

اگرچہ ملکہ کا ایک ایک انگ مرجھا گیا تھا، مگر اس کی مسکراہٹ اب بھی نہیں مرجھائی تھی۔ ملکہ نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا "دل کی طاقت کا!"

"ہاں!"

"وہ تو ڈاکٹر! پہلے ہی زیادہ ہے..... ضرورت سے زیادہ..... اسی وجہ سے تو میں مر رہی ہوں....."

انجکشن کی سوئی کو گرم پانی سے نکالتے ہوئے ڈاکٹر کا ہاتھ کانپ گیا۔ صبح نو بجے سے لے کر گیارہ بجے تک کا وقت ملاقاتیوں کے لئے تھا۔ اس وقت دس بجے تھے۔

رانی اپنی بہن کا حال پوچھنے کے لئے آ گئی تھی۔

"تو آ گئی رانی؟"

"ہاں! ملکہ۔"

"میں تجھے ہی یاد کر رہی تھی۔"

"میں آ گئی ہوں..... تیرا حال کیسا ہے؟"

"ادھر آنا!"

"بول!"

"تو نے وہ میری لال پوٹلی کہاں رکھی ہے؟"

"میں خوب سنبھال کر رکھ آئی ہوں، تو فکر مت کر!"

"اس میں بڑے قیمتی سکے پڑے ہوئے ہیں..... تو نے پوٹلی کھول کر دیکھی تھی؟"

"نہیں ملکہ میں نہیں کھولی۔ میں تمہاری اجازت کے بغیر کیسی کھول سکتی ہوں۔ تم جب ٹھیک ہو جاؤ گی، مجھے خود کھول کر دکھانا۔ تم مجھے اس وقت یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کھانے کے لئے کیا دوں؟ میں کچھ پھل لائی ہوں!"

"آج مجھ سے کچھ نہیں کھایا جاتا...... کوئی بھی پھل......"

ملکہ کی آنکھیں نڈھال ہو کر ایک پل کے لئے مندھ گئیں' پھر کسی اندرونی طاقت کے اثر سے کھل گئیں' اور وہ رانی کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی:۔

"میرے جانے کا وقت قریب آگیا ہے رانی' میرے پاس آ...... میرے سر کی رگ شاید پھٹ گئی ہے......"

"میں تیرے پاس ہوں ملکہ!"

"وہ سکے......"

"وہ کبھی نہ گم ہوں گے تو اس وقت ان کی فکر مت کر۔"

"تجھے ایک بات بتاتی ہوں۔"

"بتا!"

"وہ سکے شاید تیرے کسی کام نہ آئیں...... مگر......"

"مگر تو تو کہتی تھی کہ وہ بڑے قیمتی ہیں۔"

"بڑے ہی قیمتی ہیں......"

"میں انہیں کبھی نہ کھوؤں گی ملکہ!"

"مگر وہ اس دنیا میں چلتے نہیں......"

رانی کے ساتھ ڈاکٹر بھی ملکہ کے قریب آگیا۔

ملکہ اپنی ٹوٹتی ہوئی آواز کو جوڑ کر کہنے لگی' "ان میں ایک سکہ ہے محبت کا...... ایک یقین کا...... اور ایک امن کا...... بڑے قیمتی سکے......!"

پھر ملکہ کی آواز کسی کو سنائی نہ دی۔ رانی نے گھبرا کر ملکہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کچھ دیر ملکہ کی نبض دیکھتا رہا' پھر اس نے کمبل کا کونا اٹھا ملکہ کے منہ پر ڈال دیا۔

رانی کے من میں جو سب سے پہلا خیال آیا' وہ یہ تھا کہ آج ملکہ نہیں مری تھی' آج عورت کے حسن کو دی جانے والی اس دنیا کی تمام تشبیہات مر گئی تھیں۔

میں غیبی

کوئی انسان جب اپنی آنکھوں میں ایک چمکتا ہوا خیال پالیتا ہے' تو نیند سے لے کر جاگنے تک' اور جاگنے سے لے کر نیند تک اس کی منزل کی طرف چلتا' اور راستے میں کھڑی مخالفت کی گاڑی ہوئی سولی پر چڑھ جاتا ہے' تو اسے شہید کہا جاتا ہے۔ لیکن جو کوئی اپنی آنکھوں میں ایک چمکتا ہوا خیال بھی پالے' پھر نیند سے لے کر جاگنے تک اور جاگنے سے لے کر نیند تک' اس کی منزل کی طرف بھی چلتا رہے' لیکن پھر خود ہی اپنا مخالف بن کر اپنے راستے میں کھڑا ہو جائے اور پھر خود ہی ایک سولی گاڑ کر اس پر چڑھ جائے' تو معلوم نہیں اسے کیا کہنا چاہیے۔ اسے شہید نہیں کہا جا سکتا۔ میں تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن اسے غیبی ضرور کہا جا سکتا ہے۔ میں نے ان دونوں الفاظ کو ایک ہی جگہ پر رکھنے کے لئے یہ بات نہیں کہی' اپنے بدنصیب نام کی قسم' میں شہید لفظ کا درجہ بہت بڑا سمجھتی ہوں' اور اس لفظ کے قدموں میں کھڑی ہونے کے لئے میں نے دنیا کا سب سے چھوٹا درجہ منتخب کیا ہے------ غیبی سچ کہتی ہوں مجھے اپنے نام سے چھوٹا درجہ اور کوئی نہیں ملا۔

کلاڑ! میری آنکھوں میں تمہاری محبت کی صرف چمک پڑی تھی' سارے کا سارا سورج ہی پڑ گیا تھا۔ اور میری زندگی میں کبھی وہ دن نہیں آیا' جب میں نے اس سورج کی تاب نہ برداشت کی ہو۔ اندھیرا کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا' لیکن میں تو گھر سے اندھیرا خریدنے کے لئے نکلی تھی------ میں نے سوچا تھا میں اپنا حسن صرف اسے دوں گی' جو محل جیسے گھر سے' سونے کی تاروں جیسے کپڑوں سے اور راجاؤں کے دسترخوانوں جیسی روٹی سے اس کی قیمت چکا سکے۔

تمہیں یاد ہو گا' میں تمہیں اکثر کہا کرتی تھی------- تم اپنا سورج کسی اور کو دے دو۔ اگر میں نے تمہاری روٹی پکاتے' تمہارے میلے کپڑے دھوتے' اور تمہارے چہرے کی

طرف دیکھتے' اس سورج کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اپنی جوانی گزار دی' تو پھر میں اندھیرا کب خریدوں گی؟ اندھیرا تو صرف جوانی میں خریدا جا سکتا ہے ...... تمہارا قصور نہیں۔ میرے اپنے ہی ہونٹ میرے الفاظ کا کہنا نہیں مانتے تھے۔ میرے ہونٹ جب تمہاری سانسوں کو چھوتے تھے' وہ اپنے الفاظ کے سامنے جھوٹے پڑ جاتے تھے اور اندھیرے کی بات بھول جاتے تھے۔ میں کئی بار انہیں زبردستی اندھیرا پلایا کرتی تھی' کہ میں نے ایک غریبی کے مارے ہوئے فنکار سے محبت نہیں کرنی' مجھے کارلین کی طرح وہ حسینہ بننا ہے' جس سے تمیں منٹ مانگنے کے لئے کسی کو ایک ہزار دو سو پچاس پونڈ دینے پڑے تھے------ لیکن تم جب میری طرف دیکھتے تھے' تو اندھیرے کا پیالہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا تھا۔ اور جس کا مطلب تھا کہ میں نے وہ سب پونڈ تم پر نچھاور کر دینے تھے' جو برسوں سے میرے خیالوں میں چھنک رہے تھے۔

خود سے ناراض ہو کر میں تمہارے کمرے کی اس چھت کی طرف دیکھنے لگی تھی' جو جب بھی بارش ہوتی' تو ٹپکنے لگتی تھی' اور جسے مکان مالکن کبھی بھی ٹھیک نہیں کروا کر دیتی تھی' کیونکہ تم کبھی بھی پورا کرایہ اسے نہیں دے پاتے تھے۔ اور پھر جب میں اس چھت کے نیچے سے بھاگ جانے کے لئے اٹھتی تھی' تو میری ریڑھ کی ہڈی میری پیٹھ میں رونے لگتی تھی۔

تمہیں یاد ہو گا' تم چھٹیوں میں ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔ میں جب دوسرے تیسرے دن بازار سے سبزیاں لا کر تمہارے لئے روٹی پکاتی تھی' تو روٹی کھاتے ہوئے تم پوچھا کرتے تھے------

"تم روٹی بہت مزیدار بناتی ہو' کل ہم ہوٹل میں روٹی نہیں کھائیں گے' تم گھر روٹی پکاؤ گی؟"

"پکا دوں گی' لیکن کل تمہیں یہ روٹی بہت مہنگی پڑے گی۔"

"کتنی مہنگی؟"

"تمہیں ایک ہزار بوسے دینے پڑیں گے۔"

"ایک ہزار بوسے زیادہ ہیں' سات سو۔"

"نہیں۔"

"اچھا نو سو پچاس"

"ایک ہزار سے ایک بھی کم نہیں۔"

"اچھا' لیکن یہ بالکل ڈاکہ ہے۔"

یہ دیوانہ کھیل ہم اکثر کھیلا کرتے تھے۔ لیکن خوشی کسی بھی دیوانگی سے شرمندہ نہیں ہوتی۔

ایک بار میں نے خود سے اقرار کیا' کہ ستمبر تک میں یہ چھٹیاں مناؤں گی' اس سے زیادہ نہیں۔ ستمبر کے آنے میں ابھی تین ماہ باقی تھے' اور میں نے سوچا تھا کہ میں نے خود کو تین ماہ دے کر خود پر بڑا احسان کیا تھا۔ لیکن میرا یہ اپنا پن نہ جانے کیسا تھا' کیسا ناشکر گزار۔ جب ستمبر آیا تو یہ میری طرف اس طرح گھور کر دیکھنے لگا' جیسے میں اس کے پاس سے کچھ چرانے لگی تھی۔ یہ اور دن مانگتا تھا' میں نے اسے اور دن دے دیئے۔ لیکن میں اس سے ناراض ہوگئی------ پھر اس نے اور دن مانگے' لیکن میں اس سے اور زیادہ ناراض ہوگئی۔ اس اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے میں نے آہستہ آہستہ شک کا سہارا لیا کہ کلاڈ جب دیر سے گھر آتا تھا' تو ضرور کسی دوسری عورت سے مل کر آتا تھا۔ اور کلاڈ! اس شک کا سہارا لے کر میں روزانہ تم سے لڑنے لگی۔

تم مجھے کچھ نہیں کہتے تھے' لیکن مجھے معلوم ہے' تمہارے پیار میں کبھی غصہ ملنے لگا تھا' کبھی ترس' کبھی احسان' کبھی تھکاوٹ' اور پھر کبھی بے وفائی بھی۔ یہ چیزیں بھی سہارے کے لئے بڑی اچھی تھیں۔

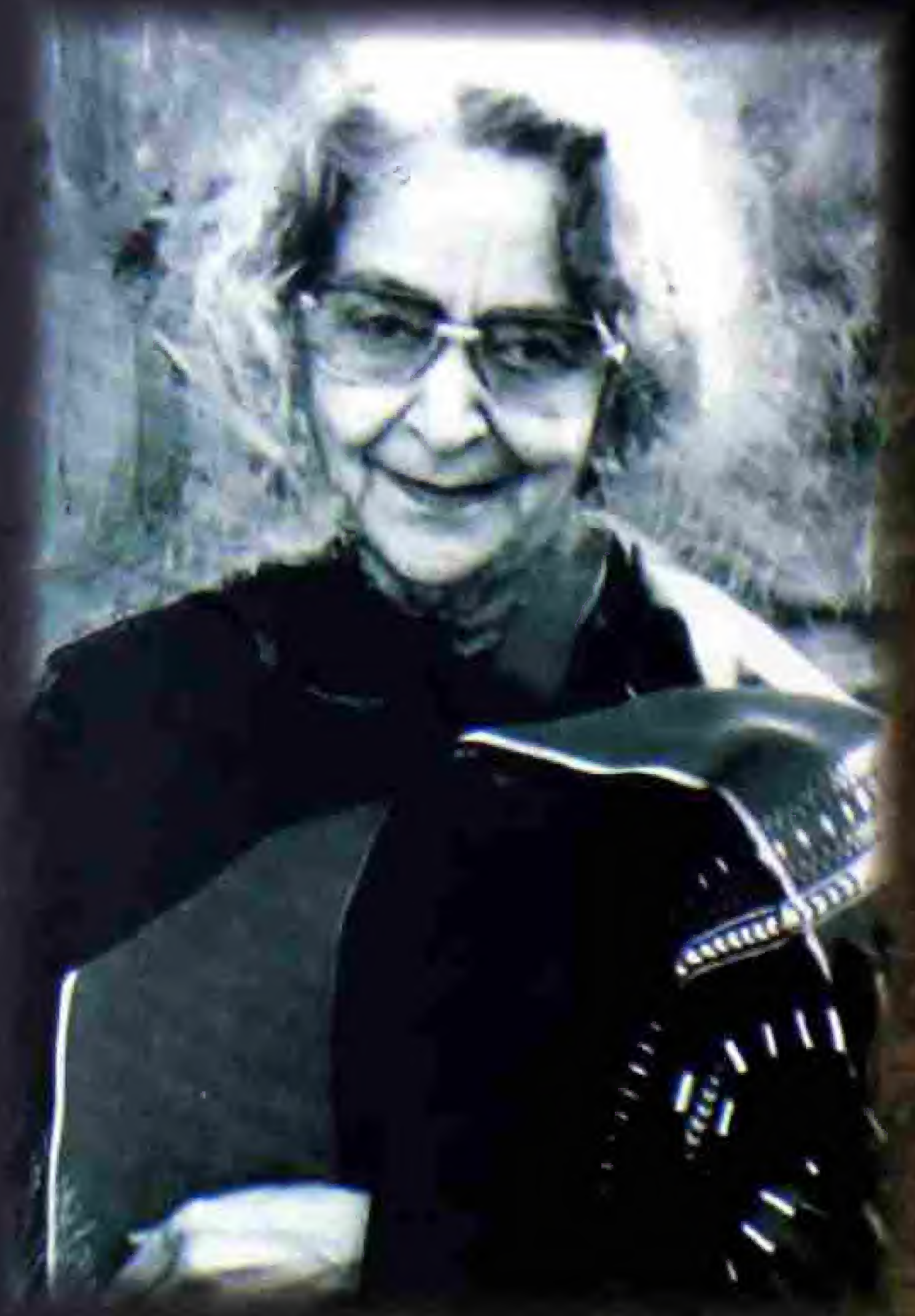
لیکن یہ سہارے بڑے خطرناک تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں ایک دن پستول پکڑا دیا معلوم نہیں' اس سے میں تمہیں مار دینا چاہتی تھی کہ خود کو' یہ میرے ہاتھ سے چل گیا۔ میں اس کی آواز سے ڈر کر بے ہوش ہوگئی۔ لیکن اس کی گولی نہ تمہارے جسم سے چھوئی تھی' نہ میرے جسم سے' دونوں جسم صحیح سلامت تھے' لیکن کچھ دنوں میں ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ میرے ہوش سلامت نہیں تھے۔ ان میں کوئی سوراخ ضرور ہوگیا تھا۔

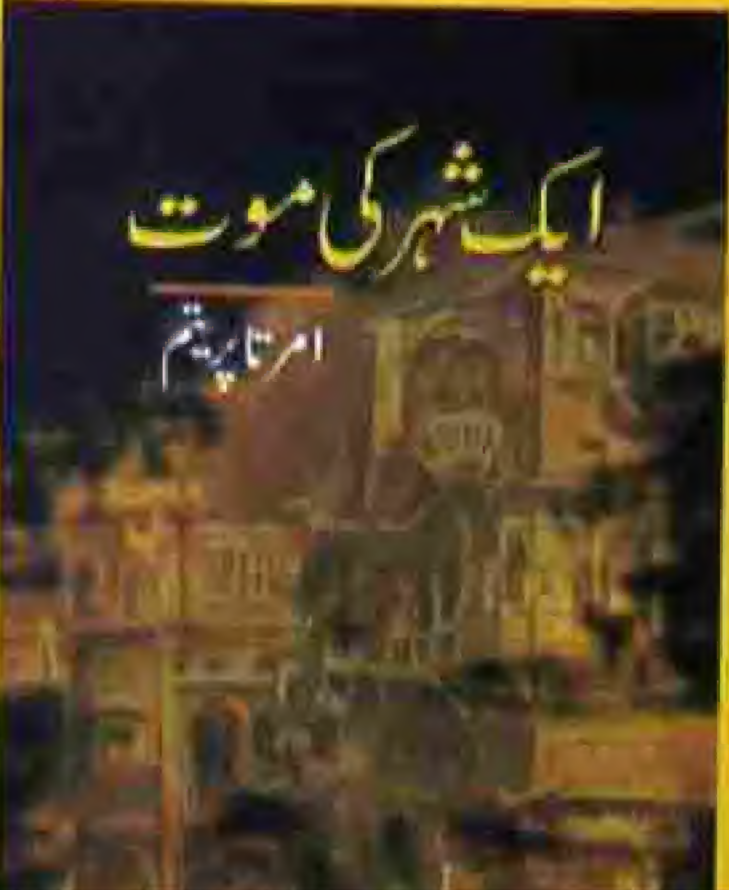
یہی ایک خوراک تھی' جس میں میں دیسی سولی گاڑ سکتی تھی' جیسی پر چڑھ کر لوگ شہید ہوتے ہیں۔ شہید ہونے کا درجہ میرے حصے میں نہیں آیا' لیکن سولی پر چڑھنا مجھے نصیب ہو

گیا۔

میں نے خود کو اندھیرے کا بیوپار کرنے کے لئے منالیا۔ محل جیسا گھر چاہتی تھی' میرے حسن نے مجھے خرید دیا۔ سونے کی تاروں جیسے لباس چاہتی تھی' میری جوانی نے مجھے خرید دیا۔۔۔۔۔۔۔

لیکن کلاڈ!۔۔۔۔۔۔ برسوں بعد جب تم کینسر سے مر رہے تھے' تمہاری بیوی تمہارے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ تمہاری بچی تمہارے دروازے کے پاس کھیل رہی تھی۔ اس وقت تمہارے گھر کے دروازے کے آگے آکر کوئی پھول رکھ گیا تھا۔ تمہاری بچی نے وہ پھول دیکھے تھے' اور لے جا کر تمہارے سرہانے رکھ دیئے تھے۔ تم نے پھولوں کو سونگھا تھا' لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں ہوا تھا' کہ وہ پھول وہاں کون رکھ گیا تھا۔ کلاڈ! وہ پھول میں نے رکھے تھے' تمہاری غیبی نے' جو مر کر بھی نہیں مری تھی۔ تمہیں معلوم ہے' جو سولیوں پر چڑھتے ہیں' وہ مر کر بھی نہیں مرتے۔۔۔۔۔۔





اُردو ادب

اُردو بازار، لاہور